تین ننّھے سُراغ رساں
سُنہری طوطے
کی تلاش میں
مقبول جہانگیر

تین ننھے سُراغ رساں

سنہری طوطے کی تلاش میں

مقبول جہانگیر

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

آدم خور گھاس

”مدد!۔۔۔۔۔ مدد!۔۔۔۔۔ مدد“ لمبی، کپکپاتی ہوئی چیخ کی آواز اُن کے کانوں میں آئی۔ عنبر اور نسیم اس وسیع باغ میں ایک طرف جھاڑیوں کے اندر دُبکے ہوئے تھے۔ یہ آواز سُن کر نسیم کا خُون خُشک ہو گیا۔ اُس نے جلدی سے عنبر کا بازو پکڑا اور آہستہ سے بولا۔ ”تم نے یہ آواز سُنی۔۔۔۔۔ کوئی بے چارہ مُصیبت میں مُبتلا ہے اور مدد کے لیے پکار رہا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آواز آئی کدھر سے۔۔۔۔۔“

”مدد!۔۔۔۔۔۔ مدد!۔۔۔۔۔ مدد!“ وہی آواز دوبارہ گونجی۔

”تعجّب ہے۔ آواز سے بالکل پتا نہیں چلتا کہ یہ عورت کی آواز ہے یا مرد کی۔۔۔۔“

عنبر نے مُسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ آواز عورت کی ہے نہ مرد کی۔“

”سبحان اللہ! تم ہمیشہ دُور کی کوڑی لاتے ہو۔“ نسیم نے چِڑ کر کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ آواز اگر عورت کی ہے نہ مرد کی تو پھر کِسی فرشتے کی ہے یا جن بھُوت کی۔“

”میرا خیال ہے، اِن میں سے بھی کسی کی یہ آواز نہیں۔“ عنبر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے نِچلے ہونٹ کی طرف بڑھا۔ جب بھی وہ کسی بات پر غور کرتا تو نِچلا ہونٹ ناخن سے نوچنے لگتا تھا۔

اس وقت وہ دونوں ایک ایسے باغ میں موجود تھے جس کی دیکھ بھال کی

طرف اُس کے مالک نے بہت مدّت سے توجّہ نہ دی تھی۔ بے شمار درختوں کے علاوہ لمبی لمبی گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی۔ جدھر دیکھو جھاڑ جھنکاڑ سر اُٹھائے کھڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر پتھّروں کی بنی ہوئی ایک بڑی عالی شان عمارت کھڑی تھی۔ شاید یہ ایک یا دو سو برس پرانی ہو گی۔ کہیں کہیں سے یہ عمارت بے حد بوسیدہ ہو رہی تھی۔ پتھّروں کا رنگ کائی جم جم کر کالا پڑ گیا تھا۔ یہ کائی بھی برسوں پرانی تھی اور بارش کے پانی کی وجہ سے اُس کی نہ جانے کتنی تہیں پتھّروں پر جم گئیں تھیں۔ غرض اِس عمارت کو دیکھ کر دل پر خوف طاری ہوتا تھا۔ موسم بھی سخت گرمی کا تھا اور باغ میں اس وقت اتنا حبس تھا کہ ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہہ رہا تھا۔

”کسی زمانے میں یہ باغ بہت خوب صورت ہو گا!“ عنبر نے کہا۔ ”افسوس کہ موجودہ مالک نے اِس کی طرف سے بے پروائی برتی۔ باغ کا ناس مار دیا۔“

”اور یہ عمارت، لگتا ہے کسی مُغل بادشاہ یا نوّاب نے بنوائی ہو گی۔“ نسیم نے

کہا۔ ”اس کی حالت تو باغ سے بھی بد تر ہے۔ یقیناً باغ اور عمارت کا مالک نہایت بے پروا آدمی ہے۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔ اس باغ اور عمارت کا مالک کسی زمانے میں ایک بڑی ریاست کا نوّاب تھا، لیکن اُس کی حماقت اور بے پروائی کے باعث آہستہ آہستہ ریاست ختم ہو گئی۔ وہ بہت مقروض ہو گیا۔ اُس نے اپنا بچا کچھا سامان بیچ کے یہ باغ اور عمارت خرید لی، اب وہی یہاں رہتا ہے اور ہمیں اُسی سے ملنا ہے۔ سُنا ہے وہ اِن حادثوں کی وجہ سے کچھ خبطی سا ہو گیا ہے۔“

”بھئی، میں اِن خبطی اور پاگلوں سے بہت گھبراتا ہوں۔“ نسیم نے کہا۔ ”نہ جانے یہ لوگ کس وقت کیا کر بیٹھیں۔“

”ہاں۔ لیکن یہ نوّاب ابھی اتنا خبطی نہیں ہوا ہے۔“ عنبر نے جواب دیا۔

قصّہ یہ تھا کہ اِن نوّاب صاحب کا ایک قیمتی پالتو طوطا گُم ہو گیا تھا۔ یہ طوطا خوب صورتی میں بڑا مشہور تھا اور نوّاب صاحب کو اُس سے بڑی محبّت تھی۔ جب سے طوطا غائب ہوا تھا، اُنھوں نے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا تھا

اور دِن رات اپنے پالتو طوطے کی یاد میں آنسو بہایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ جو شخص ان کے پالتو طوطے کا پتا نشان بنائے گا، وہ اُسے پانچ ہزار روپے انعام دیں گے۔ کئی سُراغ رساں اِس طوطے کی تلاش میں نکلے، لیکن اُسے ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔ انہی دنوں تین ننّھے سُراغ رسانوں نے بھی اخباروں میں اس اِنعام کا اِعلان پڑھا اور طے کر لیا کہ وہ یہ طوطا ڈھونڈ کر پانچ ہزار روپے انعام حاصل کریں گے اور اب اِس مقصد کے لیے وہ نوّاب جمشید علی خان سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔ عنبر نے نوّاب صاحب کو اپنے آنے کی اِطّلاع نہ دی تھی، بلکہ نوّاب صاحب کے ایک گہرے دوست سے تعارفی رُقعہ لے لیا تھا۔

"مدد!۔۔۔ مدد!۔۔۔ مدد!"

وہی پُر اسرار آواز پھر باغ میں گونجی۔ اس مرتبہ یہ عمارت کی طرف سے آئی تھی۔ نسیم نے بے چین ہو کر کہا۔ "ضرور یہ پُکارنے والا یا پُکارنے والی۔۔۔۔۔ لیکن نہیں، تُم تو کہتے ہو کہ آواز عورت کی ہے نہ مرد کی۔

بہر حال، کوئی بھی ہو، کسی آفت میں مبتلا ہے آؤ، ذرا دیکھیں تو سہی۔"

وہ دونوں دبے پاؤں جھاڑیوں سے نِکل کر عمارت کی طرف چلے، ہر طرف گہرا سنّاٹا تھا۔ دُور دُور تک کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ جس جگہ وہ دونوں جھاڑیوں میں سے نکل کر عمارت کی طرف چلے تھے، وہاں سے عمارت کا فاصلہ کوئی سو فٹ کے لگ بھگ تھا۔ ایک پتلی سی پگ ڈنڈی اس عمارت کے بڑے دروازے تک جاتی تھی۔ جُوں ہی اُن دونوں نے پگ ڈنڈی پر قدم رکھا، نسیم کا پاؤں کِسی چیز میں اُلجھا اور ایک دم وہ منہ کے بل گرا۔ اُس نے سنبھل کر اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن دوبارہ گِر پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی اَن دیکھے ہاتھ نے اُس کا پاؤں پکڑ لیا ہے۔ بد حواس ہو کر اُس نے عنبر کو آواز دی۔

"عنبر۔۔۔۔!عنبر۔۔۔۔۔۔!کسی نے مجھے پکڑ لیا ہے۔"

عنبر نے نسیم کے چیخنے کی آواز سُنی تو بد حواس ہو کر دوڑا۔ اس نے دیکھا کر لمبی لمبی گھاس کے ریشوں نے نسیم کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔

”خُدا کی پناہ۔۔۔۔!“ عنبر چلّایا۔ ”یہ گھاس تو بہت خطرناک ہے۔ اِسے آدم خور کہا جاتا ہے۔ میں نے ایک کتاب میں اِس کے بارے میں پڑھا تھا، لیکن یہ تو افریقہ اور برازیل کے جنگلوں میں اُگتی ہے۔ یہاں اِسے کون بے وقوف لایا ہے۔“

”اُفّوہ! تم نے پھر پروفیسروں والا لیکچر شروع کر دیا۔“نسیم چلّایا۔ ”میں درد سے مرا جارہا ہوں اور تمھیں اِس گھاس کی تاریخ بیان کرنے کی پڑی ہوئی ہے۔ خُدا کے لیے مُجھے اس کے جال سے نکالو۔ یہ لیکچر بعد میں دے لینا۔“

”ٹھہرو! میں ابھی اپنا چاقُو نکالتا ہوں۔“عنبر نے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر آٹھ پھلوں والا چھوٹا سا چاقُو نکال لیا۔ اِس چاقُو نے کئی مرتبہ مُشکل میں اُن کا ساتھ دیا تھا۔ پھر اُس نے نسیم کی ٹانگ پکڑی اور گھاس کے ریشے کاٹ کاٹ کر الگ پھینکنے لگا۔ چند لمحے بعد نسیم اس بلا سے آزاد ہو چکا تھا، لیکن اُس پر دہشت ابھی تک طاری تھی۔

”یہ گھاس تو واقعی خطرناک ہے۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میں نے

محسوس کیا کہ اس کے ریشے جونکوں کی طرح میری ٹانگ سے لپٹے ہوئے ہیں۔“

”خُدا نے بڑی خیر کی کہ اِس وقت میرے پاس چاقُو نِکل آیا۔“ عنبر نے گھاس سے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”اس کا انگریزی نام وِن فرا ہے۔ افریقہ اور جنوبی برازیل میں لوگ اِسے آدم خور گھاس بھی کہتے ہیں۔ چھوٹے موٹے جانوروں اور پرندوں کو اِسی طرح جکڑ کر ہڑپ کر جاتی ہے۔ اِس کی ایک صفت یہ ہے کہ جُوں جُوں اِس سے آزاد ہونے کی کوشش کی جائے، تُوں تُوں یہ جان دار کو اور زیادہ جکڑتی ہے۔ ویسے قانونی طور پر ایسے مُہلک پودوں کا گھروں یا باغوں میں اُگانا منع ہے۔“

”میرا خیال ہے، ہمیں پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیے۔“ نسیم نے کہا۔ ”فرض کرو یہ گھاس مجھے ہڑپ کر لیتی، پھر؟“

”پھر کیا؟“ عنبر نے ہنس کر کہا۔ ”اچھا ہے، تم اسکول جانے سے بچ جاتے۔ تاہم اِس گھاس سے اتنا ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اگر جیب میں

چاقو نہیں ہے تو تُم اِسے آگ دکھا کر بھی آزاد ہو سکتے ہو۔ یہ گھاس آگ سے بہت ڈرتی ہے۔"

"واہ وا! کیا کہنے ہیں آپ کے۔" نسیم نے کہا۔ "گویا ہر شخص اپنی جیب میں ماچس یا سگرٹ لائٹر ضرور رکھے۔ فرض کرو ماچس بھی نہ ہو تب کا کیا جائے؟"

"اس کا حل بھی موجود ہے۔" عنبر نے جواب دیا اور وہ یہ ہے کہ جس شخص کو یہ گھاس پکڑ لے، اُسے چاہیے کہ آزاد ہونے اور گھاس کے ریشے نوچنے کی کوشش نہ کرے۔ چُپ چاپ مُردے کی طرح پڑا رہے۔ تھوڑی دیر بعد گھاس کے ریشے اُسے خود بخود چھوڑ دیں گے۔ عجیب بات ہے کہ یہ گھاس مُردار نہیں کھاتی۔"

"بہت خوب۔" نسیم نے گردن ہلا کر کہا۔ "تم گپ اچھی ہانکتے ہو۔ مُجھے اِن باتوں پر ذرا برابر یقین نہیں آیا۔"

"یقین نہیں آیا تو۔ جہنّم میں جاؤ۔" عنبر نے مُنہ بنا کر کہا۔ "خُدا کا شُکر ادا

نہیں کرتے کہ اُس نے تمہیں اس موذی گھاس کے پنجے سے بچالیا، ورنہ اِس وقت جناب کا پنجر یہاں نظر آتا۔ گوشت پوست یہ گھاس ہضم کر چکی ہوتی۔ افسوس! احسان ماننے کے بجائے اُلٹا آپ فرماتے ہیں کہ میں گپ اچھّی ہانکتا ہوں۔ اچھّا، ایک بار پھر گھاس میں پاؤں رکھ کر تجربہ کرلو۔"

"میری توبہ جو میں کبھی اِس کے نزدیک بھی جاؤں۔" نسیم نے کان پکڑے اور کچھ اور پرے ہٹ گیا۔ "اس منحوس گھاس کی وجہ سے ہم اُس آواز کو تو بھُول ہی گئے جو مدد کے لیے پُکار رہی تھی۔

نسیم نے دیکھا کہ عنبر اپنی جگہ خاموش کھڑا ہے۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے ایک جارہا ہے۔ اُس کی نگاہیں نسیم کے پیچھے کسی شے پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے عنبر کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا اور ہونٹ خشک ہو گئے۔

نسیم نے اُس کی یہ حالت دیکھی تو بولا۔ "تم بہتری اداکار بن سکتے ہو۔ تُم نے اپنے چہرے پہ خوف اور دہشت کے جو آثار ایک دم پیدا کیے ہیں، وہ

بڑے سے بڑے اداکار کا باپ بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ ہاں، تو تُم مُجھ سے کچھ کہنے والے تھے؟"

عنبر نے کچھ جواب نہ دیا اور اُسی طرح پتھّر کا بُت بنا کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر ابھی تک خوف کے آثار تھے۔ نسیم نے جھنجھلا کر کہا۔

"یار میں کیا بکواس کر رہا ہوں؟ تُم بولتے کیوں نہیں؟ کیا گونگے، بہرے ہو گئے ہو؟"

عنبر اب بھی چُپ تھا۔ نسیم چوکنّا ہوا اور عنبر کی نگاہوں کے اشارے پر ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ اس کے بدن میں بھی تھر تھری سی چھُوٹ گئی۔ عنبر اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ یہ بات اب نسیم کی کھوپڑی میں آئی۔ نسیم کے بالکل پیچھے کوئی دو یا تین فٹ کے فاصلے پر ایک موٹا تازہ کالے رنگ کا آدمی ہاتھ میں بڑا سا ریوالور لیے کھڑا تھا۔ ریوالور کا رُخ عنبر اور نسیم دونوں کی طرف تھا۔

اُس موٹے تازے آدمی کے چہرے پر دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ اگر اُس

نے اپنی آنکھوں پر کالے شیشوں کا چشمہ نہ چڑھایا ہوتا تو عنبر اور نسیم کو اندازہ ہو سکتا کہ اُس کے صحیح خیالات کیا ہیں، کیوں کہ کسی انسان کی آنکھیں ہی اُس کے صحیح خیالات کا پتا دے سکتی ہیں۔

اس کے جسم پر کالے رنگ کا گرم سوٹ تھا۔ اُس گرمی میں گرم سوٹ؟ نسیم اور عنبر کو اِس بات پر بھی دل ہی دل میں تعجّب ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ شخص پاگل ہے۔

"آہاہاہا۔" موٹے نے ریوالور گھما کر زور سے قہقہہ لگایا۔ "ہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔ کیوں؟ کیسی رہی؟ تم بھلا مُجھ سے بچ کر کہاں جا سکتے ہو؟" یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور بولا:

"چلو۔۔۔۔۔ سیدھے۔۔۔۔۔۔ اُس عمارت کے اندر۔۔۔۔۔ خبر دار کوئی شرارت کی تو میں فوراً گولی چلا دوں گا۔۔۔ سمجھے؟ بس میرے حکم کی تعمیل کرو۔" اُس نے پھر دو تین مرتبہ پستول ہلایا۔

عنبر اور نسیم بے چُون و چرا موٹے کے اشارے پر اُس عمارت کی جانب

چل پڑے۔ اُن کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور حلق میں کانٹے سے چُبھ رہے تھے۔ نسیم نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن موٹے نے ڈانٹ کر کہا: ”خاموش۔۔۔۔! میں ابھی کچھ نہیں سُنوں گا۔ پہلے اُس عمارت میں چلو۔ راستے میں بولنے کی کوشش بے کار ہے۔“

نسیم کی آواز اندر ہی اندر گھُٹ کے رہ گئی۔ اُس نے عنبر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بے بس تھا۔ دونوں نے چلنا شروع کیا۔ موٹا ریوالور سنبھالے اُن کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، لیکن وہ اِن پھُرتیلے لڑکوں کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ جلد ہی وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔

”ٹھ۔۔۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔۔۔ ٹھہر۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔!“ موٹے نے اُنہیں حکم دیا۔ شاید اُس کے لیے اب اتنی تیز چلنا مُمکن نہ رہا تھا۔ ”میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ رُک جاؤ۔۔۔۔۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔۔۔۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔۔۔۔۔ میں تمہاری چالاکی سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔۔ تمہارا خیال ہے مُجھے دھوکا دے کر بھاگ نکلو گے۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ رُک

جاؤ۔" عنبر اور نسیم ٹھہر گئے اور موٹے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ بھاڑ سا منہ پورا کھُلا ہوا تھا اور وہ کسی جنگلی درندے کی طرح زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔

"جناب۔۔۔۔ کیا آپ ہی نوّاب جمشید علی خان صاحب ہیں؟" نسیم نے نہایت ادب سے پوچھا۔ "اگر آپ نوّاب جمشید علی خان نہیں ہیں تو پھر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کون ہیں اور یوں ہم پر ریوالور تان لینے کا آخر مقصد کیا ہے؟"

"ہاہاہا۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔!" موٹے نے قہقہہ لگایا۔ "کوئی نیا جھانسا دینے کی فکر میں ہو لڑکو! لیکن یاد رکھو میں تمہارے کسی جھانسے میں نہیں آ سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ میں کون ہوں تو اِس کا جواب تمہیں اِس عمارت کے اندر چل کر ہی ملے گا۔ چلو۔۔۔۔"

اس نے اِس دوران میں اپنا پھُولا ہوا سانس دُرست کر لیا تھا، ریوالور کے اشارے پر عنبر اور نسیم دونوں پھر آگے چل پڑے۔ عمارت کے اندرونی

بڑے دروازے کے نزدیک پہنچ کر وہ رُک گئے۔ موٹے نے گرج دار آواز میں حکم دیا:

"دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ اندر جاؤ۔۔۔۔۔ پھر دائیں طرف مُڑو اُدھر ایک کمرا ہے، سامنے ہی دیوار کے ساتھ چند کُرسیاں دھری ہیں۔ اُن کُرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔"

عنبر نے ہاتھ بڑھا کر ہینڈل گھمایا۔ دروازہ فوراً کھُل گیا۔ سامنے ایک بڑا ہال کمرا تھا جس کے اندر روشنی نہ تھی اور کچھ اندھیرا اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ڈرتے ڈرتے اندر گئے۔ دائیں طرف مُڑے۔ ایک اور کمرا دکھائی دیا۔ یہاں پُرانا اور بوسیدہ فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر تین طرف الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں بھری تھیں۔ درمیان میں ایک لمبی میز پر بہت سی کتابیں اور رسالے پڑے تھے۔ شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ چار بڑی بڑی کُرسیاں دھری تھیں۔ کسی زمانے میں یہ کرسیاں خاصی قیمتی ہوں گی، لیکن اب ان کی بُنائی اُدھڑ چکی تھی اور لکڑی کا پالش بھی کالا پڑ گیا

تھا۔ نسیم اور عنبر اُن میں سے دو کُرسیوں پر دھنس گئے۔

موٹے نے اب اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر وہ اُن کے نزدیک کھڑا غور سے جائزہ لیتا رہا، پھر ریوالور جیب میں رکھ کر بولا۔ "ہاں، اب بتاؤ۔ تُم یہاں کس شرارت کے لیے آئے تھے اور جھاڑیوں میں دُبک کر کیا کر رہے تھے؟"

"اگر آپ نوّاب جمشید علی خان ہی ہیں تو پھر ہمارا جواب بھی سُن لیجیے۔" عنبر نے کہا۔ "ہم صرف آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ قصّہ یہ ہے کہ۔۔۔۔۔"

لیکن موٹے آئی نے اُسے بات پوری نہ کرنے دی اور ماتھے پر شکنیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تُم۔۔۔ مُجھ سے ملنے آئے تھے؟ لیکن لڑکو ملنے کا جو طریقہ تُم نے اختیار کیا، وہ تو چوروں اُچکّوں جیسا تھا۔ میں پوچھتا ہوں، تُم بندروں کی طرح جھاڑیوں میں آخر کِس مقصد کے لیے چھُپے ہوئے تھے؟"

"اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے کسی کے چلّانے کی آواز سُنی تھی۔" نسیم نے کہا۔ "مدد۔۔۔۔ مدد۔۔۔ ہم جاننا چاہتے تھے کہ کون ہے جو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔"

"اچھا، تو تُم لوگوں نے وہ آواز سُن لی تھی۔" موٹے نے کہا۔

"جی ہاں جناب، ہم نے وہ آواز کئی مرتبہ سُنی۔" عنبر نے جواب دیا اور یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور موٹے آدمی کی طرف بڑھایا۔ "ہم نے پچھلے دِنوں اخباروں میں پڑھا تھا کہ آپ کا پالتو سُنہری طوطا گُم ہو گیا ہے اور جو اسے ڈھونڈے گا آپ اسے پانچ ہزار روپے انعام دیں گے۔ ہم اِس کام کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ خان بہادُر شرافت حسین نے آپ کے نام یہ خط بھی ہمیں دیا ہے۔ اس خط کو پڑھیے، اور یہ رہا ہمارا تعارفی کارڈ۔"

موٹے نے تعجّب سے عنبر اور نسیم کو دیکھا، پھر لفافہ اور کارڈ اس سے لے کر پہلے کارڈ پر نظر دوڑائی۔

تین ننھے سُراغ رساں

ہم مُشکل سے مُشکل گتھیاں سلجھا سکتے ہیں

؟ ؟ ؟

سُراغ رساں نمبر ایک: عنبر

سُراغ رساں نمبر دو: نسیم

سُراغ رساں نمبر تین: عاقِب

"بہت خوب! بھئی، بہت خوب!" موٹے نے کہا۔ "پھر اُس نے لفافہ کھول کر خان بہادر کا خط بھی پڑھا۔ "لاحول ولا قوّۃ۔ بھئی معاف کرنا۔ میں تمھیں چور اُچکّا سمجھتا رہا، لیکن تُم لوگ تو سُراغ رساں نکلے۔ بہر حال، مجھے اپنی اس حرکت پر افسوس ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تُم میں سے سُراغ رساں نمبر ایک اور نمبر دو کون ہے؟ اور ہاں سُراغ رساں نمبر تین تمہارے ساتھ نہیں آیا؟"

”جناب، میں سُراغ رساں نمبر ایک ہوں، میرا نام عنبر ہے۔ یہ میرا ساتھی اور دوست نسیم ہے، سُراغ رساں نمبر دو۔ ہمارے تیسرے ساتھی کا نام عاقِب ہے۔ اس وقت وہ نہیں آ سکا۔ خُدا نے چاہا تو آیندہ ملاقات کے موقع پر وہ بھی حاضر ہو جائے گا۔“

موٹے آدمی نے کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا۔ گویا تُم لوگ میرے گُم شدہ سُنہری طوطے کی تلاش کا کام کرنا چاہتے ہو۔“

ان دونوں نے جلدی جلدی گردنیں ہلائیں۔ موٹا آدمی مُسکرایا۔ اُس کی مُسکراہٹ دیکھ کر عنبر اور نسیم بھی مُسکرائے، لیکن دوسرے ہی لمحے اُن کی مُسکراہٹ غائب ہو گئی۔ موٹے نے گرج کر کہا:

”میں تُمھاری اِن باتوں پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا۔ بس اب مرنے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔ ایسے جھُوٹوں اور مکّاروں کی سزا میرے نزدیک موت ہے۔ میں تمھیں مار کر یہیں باغ میں دفن کر دوں گا۔“ یہ سُنتے ہی عنبر اور

نسیم کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ اُن کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، موٹے نے ایک سِگار نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ پھر ریوالور میں سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ اُنہوں نے چونک کر دیکھا۔ ریوالور کی نال میں سے نیلے رنگ کا شعلہ نکلا۔ موٹے نے اُس شُعلے سے سگار سلگایا اور اطمینان سے کش لگانے لگا۔ پھر اُس نے ریوالور میز پر رکھ دیا۔

"کہو کیسی رہی؟" اُس نے ہنس کر کہا۔ "ڈر گئے نا؟"

عنبر اور نسیم کے ہونٹوں پر بھی پھیکی ہنسی نمودار ہوئی۔ اب اُن کی سمجھ میں آیا کہ یہ اصلی ریوالور نہیں تھا، بلکہ سِگار سُلگانے کے لیے لائٹر ریوالور کی شکل کا بنایا گیا تھا۔

"جناب، اگر اس مذاق سے میرے دل کی حرکت بند ہو جاتی تو اُس کی ذمّے داری کس پر ہوتی؟" نسیم نے مُنہ بنا کر کہا۔

موٹے نے قہقہہ لگایا۔ "بھئی، اگر تم لوگ جاسوسی کا دھندا کرنے چلے ہو تو تمھیں اپنا دل مضبوط رکھنا چاہیے۔ کمزور دل والوں کا یہ کام ہی نہیں۔ بہر

حال، مجھے تُم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔"

اس نے مُصافحے کے لیے اپنا بھاری ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔ "مجھے کل ہی خان بہادر شرافت حسین نے ٹیلی فون کیا تھا اور تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ میں اِن ننّھے سُراغ رسانوں کا پہلے ایک چھوٹا سا امتحان لوں گا۔ اگر وہ اس امتحان میں کام یاب ہو گئے تو پھر اُنہیں کوئی نہ کوئی ایسا کام ضرور سونپ دوں گا جس سے اُنہیں دل چسپی ہو؟"

"اب جلدی بتائیے کہ اس امتحان کا نتیجہ کیا رہا؟" نسیم نے کہا۔ "ہم پاس ہوئے یا فیل؟"

"تم پاس ہو گئے ہو اور میں تمہیں اس کام یابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ فی الحال تمہیں اپنے سُنہری طوطے کی تلاش کا کام نہیں دے سکوں گا؟"

نسیم اور عنبر نے حیران ہو کر کہا۔ "کیوں؟ کیا آپ کا قیمتی طوطا کھویا نہیں گیا؟"

"بھئی طوطا کھویا تو ضرور گیا تھا۔" موٹے نے سِگار کا کش لگا کر دھویں کا بادل منہ سے نکالتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن عجیب اتّفاق ہے کہ آج صُبح وہ خود بخود واپس آ گیا۔ میں نے اُس کے لیے اپنی خواب گاہ کی ایک کھڑکی کھول رکھی تھی۔ صُبح ہی صُبح وہ اُڑتا ہوا آیا اور کھڑکی کے قریب بیٹھ کر بولنے لگا:

"نوّاب صاحب، آداب عرض کرتا ہوں۔۔۔۔۔ آداب عرض کرتا ہوں حضور، مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟"

"ارے؟" نسیم نے کہا۔ "طوطا اِس قسم کی باتیں بھی کر لیتا ہے؟"

"ہاں میاں۔ بہت بولتا ہے وہ۔" موٹے نے آپ ہی آپ خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے تو میں نے اُسے ڈھونڈنے والے کے لیے پانچ ہزار روپے کا اعلان کیا تھا۔ بہر حال، سُنہری خان واپس آ گیا؟"

"سُنہری خان؟" نسیم نے حیرت سے کہا۔ "وہ کون ہے؟"

"اوہو! نہیں سمجھے تم۔" موٹے نے ہنس کر کہا۔ "سُنہری خان اُسی طوطے کا نام ہے۔ میں نے رکھا ہے۔"

"خُوب! اب میں سمجھا۔" نسیم نے کہا۔ "لیکن یہ تو بتایئے کہ وہ مدد مدد کے لیے کون پکار رہا تھا؟"

موٹے نے پھر زور سے قہقہہ لگایا۔ "آہا! تُم بھی دھوکا کھا گئے نا، میں نے اسے بڑی محنت سے بولنا سکھایا ہے اور اداکاری کے گُر بھی بتائے ہیں۔ مثلاً اُسے سمجھایا کہ دیکھو، سُنہری خان، تمہارا یہ پنجرا ایک قسم کی جیل ہے جس میں تم بند ہو۔ اب اگر تُم اس جیل سے آزاد ہونے کے خواہش مند ہو تو مدد کے لیے پکارو، خوب چیخو، چلاؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی تمہاری مدد کو آن پہنچے۔" یہ کہہ کر موٹے نے پھر زوردار قہقہہ لگایا۔

"جناب، کیا ہم سُنہری خان کو دیکھ سکتے ہیں؟" نسیم نے پوچھا۔ "جو باتیں آپ نے بیان فرمائیں، اُن سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ذہین طوطا ہے۔ ہمیں اُس سے مل کر خوشی ہوگی۔"

”ہاں ہاں۔ وہ بھی تُم سے مل کر خوش ہو گا۔“ موٹے نے کہا۔ ”لیکن افسوس کہ اِس وقت تُم اُس سے نہیں مل سکو گے۔ جب وہ واپس آیا تو بے حد شور مچا رہا تھا۔ تُم نے خود اُس کی آوازیں سُنی ہیں۔ پہلے تو میں نے اُسے سمجھایا کہ چُپ ہو جاؤ، مگر اُس نے میری ایک نہ سُنی اور برابر چیختا چلّاتا رہا۔ مجبور ہو کر میں نے اُس کے پنجرے پر غلاف چڑھا دیا۔ غلاف چڑھاتے ہی پنجرے میں اندھیرا ہو جاتا ہے اور سُنہری خان سمجھتا ہے کہ رات ہو گئی، چناں چہ وہ فوراً چُپ ہو گیا۔ اب اگر میں غلاف اُتاروں تو وہ دوبارہ چلّانا شروع کر دے گا اور میرے سر میں درد ہو جائے گا۔“

”بس تو پھر ہمارا یہاں رُکنا اور آپ کا وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔“ عنبر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا طوطا خود بخود واپس آ گیا اور پانچ ہزار روپے بچ گئے۔ اچھا نوّاب صاحب ہمیں جانے کی اجازت دیجیے۔ سُنہری خان سے پھر کسی دِن مل لیں گے۔“

عنبر کے لہجے میں مایوسی تھی۔ موٹے نے کہا۔ ”میں تُم لوگوں کا شُکر گزار

ہوں۔ تمہارا یہ ملاقاتی کارڈ سنبھال کر رکھوں گا۔ ممکن ہے کبھی مجھے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے جس میں تُم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہو اُس وقت میں تمہاری خدمات ضرور حاصل کروں گا۔"

وہ اُنہیں دروازے تک رخصت کرنے آیا اور پھر عمارت کے اندر چلا گیا۔ عنبر اور نسیم اُسی پگڈنڈی پر واپس آئے جہاں آدم خور گھاس نے نسیم کا پاؤں پکڑ لیا تھا۔

"اُفّوہ، ہم اِس موذی گھاس کے بارے میں نوّاب صاحب سے پوچھنا تو بھول ہی گئے۔" نسیم نے رُک کر کہا۔

"چلو چھوڑو۔ پھر کبھی پوچھ لیں گے۔" عنبر نے کہا۔ "گھاس بھی یہیں ہے اور نوّاب صاحب بھی یہیں ہیں۔ ویسے ایسی خطرناک چیز یہاں ہوئی نہیں چاہیے۔"

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ آخر اس جگہ پہنچے جہاں اللہ داد ڈرائیور چمکتی دمکتی مرسیڈیز کار لیے اُن کے انتظار میں تھا۔ اُن کو دیکھتے ہی اُس نے

پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں اندر جا بیٹھے۔ اللہ داد نے اپنی سیٹ پر بیٹھے کر انجن اسٹارٹ کیا اور گردن موڑ کر عنبر کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"گھر چلو، اللہ داد!" عنبر نے کہا۔ "نوّاب صاحب کا کھویا ہوا طوطا خود بخود واپس آ گیا ہے۔"

اللہ داد نے گاڑی کا رُخ موڑا۔ اب وہ آہستہ آہستہ نوّاب جمشید علی خان کے پرانے محل کی اُس بُلند دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے جو باغ کے گِرد کھچی ہوئی تھی۔ عنبر کار کی کھڑکی سے منہ لگائے باہر دیکھ رہا تھا کہ یکایک اُس کا ہاتھ نچلے ہونٹ تک پہنچ گیا۔ اُس کے دماغ کی بیٹریاں ایک دم روشن ہو گئی تھیں۔ یقیناً کوئی خاص بات اُس کے دیکھنے میں آئی تھی۔

کار ابھی مشکل سے پچاس ساٹھ گز دُور ہی گئی ہو گی کہ عنبر نے اُونچی آواز سے کہا۔

"اللہ داد، گاڑی روکو۔"

اللہ داد نے اُسی وقت بریک لگا کر کار روک دی "کیا واپس چلوں؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ یہیں رُکے رہو۔" عنبر نے عالی شان عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جوش سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ نسیم اُس تمام کارروائی پر حیران پریشان تھا۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ کہنے لگا:

"کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ ماجرا ہے کیا ہے؟ گاڑی رُکوانے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"آہ! تم نہیں دیکھتے؟" عنبر نے کہا۔ "یہاں ٹیلے فون کے تار کہیں نظر نہیں آتے۔ حال آں کہ اُن کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"ٹیلی فون کے تار؟" نسیم نے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیا۔ "معلوم ہوتا ہے گرمی میں تمہارے دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے، آخر ٹیلے فونوں کے تار اِس وقت کیوں یاد آ گئے۔"

عنبر مُسکرایا۔ "نسیم، تُم کبھی اچھے سُراغ رساں نہیں بن سکتے۔ تمہارے

اندر سوچنے اور دیکھنے کا مادّہ سِرے سے ہے ہی نہیں۔ کیا تُمھیں یاد نہیں رہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے نوّاب جمشید علی خان نے ہم سے کہا تھا کہ خان بہادر شرافت حسین نے فون پر اُن سے بات کی تھی اور نوّاب صاحب کو ہمارے بارے میں بتایا تھا؟"

"ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔ یہی بات نوّاب صاحب نے ہم سے کہی تھی۔" نسیم نے اقرار کیا۔

"لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نوّاب صاحب نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ خان بہادر شرافت حسین نے اُنھیں فون کیا ہی نہیں۔"

"اچھا! وہ کیسے؟" اب نسیم کے کان بھی کھڑے ہوئے۔ "بھلا نوّاب جمشید علی خان کو ہم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس پر بعد میں غور کریں گے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُنھوں نے ہم سے جھوٹ بولا۔ کیوں کہ اِس عمارت میں ٹیلے فون ہے ہی نہیں۔ اگر ٹیلے فون ہوتا تو ہمیں اُس کے کھمبے اور اُن پر تار بھی دکھائی دیتے، لیکن یہاں کوئی

کھمبا ہے نہ تار۔"

"مگر نوّاب صاحب نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"اس لیے کہ وہ موٹا آدمی نوّاب جمشید علی خاں تھا ہی نہیں۔" عنبر نے ہنس کر کہا۔ "وہ کوئی دھوکے باز اور جعل ساز تھا جو ہم سے نوّاب جمشید علی خان بن کر ملا اور ہم نے مدد مدد کی جو آواز سُنی، وہ آواز سُنہری طوطے کی نہیں، اصلی نقاب جمشید علی کی ہو گی۔"

نقلی نوّاب

ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ اتنے میں نوّاب صاحب کے محل کی دوسری جانب کے ایک دروازے سے سُرخ رنگ کی کار تیزی سے باہر آئی اور کچی سڑک پر دھول اُڑاتی ہوئی مغرب کی جانب جانے لگی۔ نسیم اور عنبر کی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی پر پڑی۔

"نقلی نوّاب!" نسیم ایک دم چلّایا۔

"ہاں، یہ وہی ہے۔" عنبر نے کہا۔ "اللہ داد! جلدی کرو۔ اس کار کے

تعاقب میں اپنی گاڑی چھوڑ دو۔ خبر دار! نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ نقلی نوّاب کہاں جارہاہے اور کس چکّر میں ہے۔"

اللہ داد نے کار دوبارہ چلادی۔ نسیم کہنے لگا۔ "لیکن یہ تو سوچو عنبر، کہ ہمیں اِس نقلی نوّاب کو پکڑنے سے کیافائدہ پہنچے گا؟ ہمارے پاس اِس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ اُس عمارت میں اگر اصلی نوّاب جمشید علی خان کسی مُصیبت میں ہیں اور وہی مدد کے لیے پُکار رہے تھے تو ہمیں پہلے اُن کی مدد کرنی چاہیے۔"

عنبر نے ایک لمحے اس مشورے پر غور کیا۔ پھر بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں پہلے اصلی نوّاب کی خبر لینی چاہیے کہ وہ کس حال میں ہیں۔ اللہ داد! مہربانی کرکے گاڑی پھر اُسی عمارت کی طرف موڑلو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ اُس دروازے کے قریب گئے جہاں سے نقلی نوّاب کار لے کر نکلا تھا۔ یہاں کھجوروں کے درختوں کا ایک بڑا جھُنڈ تھا۔ اللہ داد نے

گاڑی اُسی جھُنڈ کے اندر لے جا کر روک دی۔ عنبر نے کہا:

"نسیم، کیا تُم اِس کار کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو جو نقلی نوّاب لے کر گیا ہے؟"

"ہاں، چند باتیں بتا سکتا ہوں۔ یہ سُرخ رنگ کی دو دروازوں والی سپورٹس ماڈل کار ہے۔ بے حد قیمتی۔ میرا خیال ہے، انگلستان کی بنی ہوئی ہو گی۔ اس پر نمبر پلیٹ شاداب نگر کی لگی ہوئی ہے۔ افسوس کہ وہ اتنی تیزی سے گُزری کہ میں پورا نمبر نہیں دیکھ سکا۔ البتّہ اتنا یاد ہے کہ آخری ہندسہ ۱۳ تھا۔"

"بہت خوب!" عنبر نے کہا۔ "اللہ داد، کیا تُم نے اُس کار کا نمبر غور سے دیکھا تھا؟"

"نہیں میاں۔" اللہ داد نے بتایا۔ "میری توجّہ اُس وقت سڑک کی طرف تھی۔ میں نے کار کی صرف ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔ واقعی وہ اسپورٹس ماڈل کار ہے اور انگلستان ہی کی بنی ہوئی ہے۔"

”خیر ،اِس پر بعد میں غور کریں گے۔ آؤ ذرا اصلی نوّاب جمشید علی خان کی خبر لیں کہ وہ بے چارے کس حال میں ہیں۔ ممکن ہے وہ اُس موٹے بد معاش کے بارے میں کُچھ بتائیں۔“

ابھی وہ دونوں اپنی گاڑی سے اُتر کر عمارت کے اندرونی دروازے کی جانب چند قدم ہی چلے تھے کہ فضا میں ایک ہیبت ناک چیخ گونجی:

”مدد۔۔۔۔! مدد۔۔۔۔! خدا کے واسطے۔۔۔ کوئی میری۔۔۔۔۔ مدد۔۔۔۔ کرو۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ مر رہا ہوں۔۔۔ مدد۔۔۔۔۔ مدد!“

آواز سُنتے ہی وہ دونوں رُک گئے۔ پھر بھاگتے ہوئے عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ اِتنی بڑی عمارت اُس وقت سُنسان پڑی تھی جیسے وہاں صدیوں سے کوئی نہ آیا ہو۔ مُختلف کمروں میں جا کر اُنھوں نے دیکھا بھالا، لیکن مدد کے لیے چلّانے والے کا کہیں نشان نہ پایا۔ آخر وہ عمارت کے پچھلے حصّے میں گئے۔ وہیں ایک تاریک کمرے کے اندر سے اُنھوں نے کسی کے

تکلیف سے کراہنے کی آوازیں سُنیں۔

"اِدھر۔۔۔۔۔" نسیم نے کہا اور چند لمحوں بعد وہ اس بدنصیب کو تلاش کر لینے میں کام یاب ہو گئے۔ یہ لمبے قد کا ایک آدمی تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں مضبوط ڈوری سے خوب کس کر باندھے گئے تھے اور منہ میں رومال ٹھونس دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے جلدی جلدی اُس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور منہ سے رومال نکالا، پھر وہ اُسے سہارا دے کر ایک صوفے پر لے گئے اور آرام سے لِٹا دیا۔

"نوّاب صاحب، گھبرایئے مت۔۔۔ اب آپ خطرے باہر ہیں۔" نسیم نے کہا۔ پھر اُنھوں نے دو کُرسیاں گھسیٹ کر صوفے کے قریب رکھیں اور اُن پر بیٹھ گئے۔

"لڑکو، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم تھوڑی دیر اور نہ آتے تو میں مر چُکا ہوتا۔"

"ہمارا خیال ہے، اِس واردات کی اِطّلاع پولیس کو دینی چاہیے۔" عنبر نے

کہا۔ ”یہی مناسب ہو گا۔“

نوّاب جمشید علی نے جلدی سے کہا۔ ”پولیس کو کیوں کر اِطّلاع دی جا سکتی ہے۔ میرے گھر میں ٹیلے فون ہی نہیں ہے۔“

”اس کی فکر نہ کیجیے، جناب۔ ہمارے پاس جو کار ہے اُس میں ٹیلے فون لگا ہوا ہے۔“ نسیم نے کہا۔

”نہیں۔ فی الحال پولیس کو اِطّلاع دینا درست نہ ہو گا۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے جو میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ، تم لوگ ہو کون اور اِس عمارت میں کیسے آئے؟“

عنبر نے فوراً ملاقاتی کارڈ نکال کر نوّاب صاحب کے سامنے رکھ دیا اور بولا ”جناب ہمیں سُراغ رسانی کا شوق ہے۔ پچھلے دِنوں ہی ہم نے ایک معمّا حل کیا تھا۔ اس کے بارے میں تفصیل سے کبھی آپ کو بتائیں گے۔ ہمیں اس وقت خان بہادُر شرافت حسین نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سُنا ہے آپ کا سنہری طوطا گُم ہو گیا ہے اور آپ نے تلاش کرنے والے کے لیے

پانچ ہزار روپے انعام کا اعلان کیا ہے؟"

"بہت خوب۔ میں تُم سے مل کر خوش ہوا۔ خان بہادر شرافت حسین میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔ اُنھوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تمہیں میرے پاس بھیجا ہو گا۔ واقعی میرا قیمتی طوطا گُم ہے اور میں نے پولیس کو اس کی اِطّلاع دی تھی، لیکن پولیس اُس کا کھوج لگانے میں ناکام رہی۔ اُس نے یہ کہہ مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ طوطا خود ہی کِسی نہ کِسی دِن واپس آجائے گا اور نہ واپس آئے تب بھی کیا ہرج ہے۔ آپ دوسرا طوطا خرید سکتے ہیں۔ مجھے پولیس والوں کے اس مذاق پر بڑا طیش آیا اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس بارے میں پولیس کو زحمت نہ دوں گا۔ جب سے میرے مالی حالات خراب ہوئے ہیں، لوگوں نے میری طرف توجّہ دینی چھوڑ دی ہے۔ سچ، لوگ مال دولت دیکھتے ہیں۔ شرافت اور انسانیت کی قدر کسی کے دل میں نہیں رہی، لیکن سُنو لڑکو! میں ابھی اتنا گیا گزرا نہیں ہوں۔ خدا کا دیا اب بھی میرے پاس بہت کچھ ہے۔"

یہ کہہ کر نوّاب جمشید علی خان ہانپنے لگے۔ اتنی لمبی گفتگو کرنے سے اُن کا سانس پھول گیا اور آواز بھرّا گئی تھی۔ شاید اُن کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

”میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ کوئی عزیز ہے، نہ رشتے دار۔ وقت کاٹنے کے لیے اس طوطے کو بڑے شوق سے پالا تھا، لیکن وہ کم بخت بھی اُڑ گیا یا کوئی اُسے لے گیا۔ بھلا کوئی طوطا پنجرے سمیت بھی اُڑ سکتا ہے؟“

”پنجرے سمیت؟“ نسیم نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ ایک شام جب میں نے دیکھا تو وہ پنجرے سمیت غائب تھا۔“ نوّاب صاحب نے آہ بھر کر کہا۔ ”اگر وہ ہکلا نہ ہوتا تو بہترین طوطا تھا لیکن اِس عیب کر اُس کی خوب صورتی اور سنہری پروں نے چھُپا لیا تھا۔“

”ہکلا طوطا؟“ نسیم کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ”کیا طوطے بھی ہکلے ہوتے ہیں؟ میں نے آج تک کبھی نہیں سُنا؟“

”وہ طوطا ہکلاتا تھا۔“ نوّاب جمشید علی نے بتایا۔ ”میں نے اُسے مرزا غالبؔ کی غزلوں کے کئی شعر بڑی محنت سے یاد کرائے تھے اور آج کل علاّمہ اقبال کی نظمیں یاد کرا رہا تھا۔“

”تعجّب ہے۔“ نسیم نے کہا۔ ”اُسے شُبہ ہو رہا تھا کہ نوّاب صاحب کی دماغی حالت درست نہیں ہے، بھلا کوئی سمجھ دار آدمی پہلے طوطے کو مرزا غالبؔ یا علامہ اقبال کا کلام یاد کرایا کرتا ہے؟“ اس نے عنبر کی طرف مُسکرا کر دیکھا لیکن وہ خاموشی سے اپنا نچلا ہونٹ نوچنے میں مصروف تھا۔

چند لمحوں بعد عنبر نے نوّاب صاحب سے پوچھا۔ ”مہربانی فرما کر اپنے عجیب و غریب طوطے کے بارے میں کچھ اور باتیں بتایئے۔ آپ نے اُسے کب خریدا؟ کِس سے خریدا؟ میں حیران ہوں کہ آخر چور نے اُس طوطے کو پنجرے سمیت چُرانے کی کوشش کیوں کی؟“

نوّاب جمشید علی نے بتایا۔ ”کوئی تین ہفتے پہلے ایک شخص طوطے بیچتا ہوا آیا تھا۔ اُس کے پاس گدھا گاڑی تھی۔ گاڑی پر بہت سے پنجرے رکھے تھے۔

پنجروں میں طرح طرح کے طوطے اور دوسرے پرندے قید تھے۔ اُس شخص نے میرے پاس آن کر کہا کہ مُجھے بیگم مریم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اُنہوں نے خود بھی اپنے لیے ایک طوطا خریدا ہے اور کہا ہے کہ کوئی طوطا آپ بھی خرید لیں۔ چنانچہ میں نے وہ سنہری طوطا خرید لیا۔"

"کیا اس طوطے والے نے اپنا نام پتا بھی آپ کو بتایا تھا؟"

"نہیں میں نے کچھ نہیں پوچھا اور نہ اُس نے بتایا۔ وہ میلے اور پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ طوطا فروخت کرنے کے لیے بے چین ہے، بہر حال، میں نے اُسے ضرورت مند سمجھ کر وہ طوطا پچاس روپے میں خرید لیا۔"

"پچاس روپے میں طوطا؟" نسیم نے نوّاب صاحب کی طرف تعجّب سے دیکھ کر کہا۔ "جناب، اتنی رقم میں تو چھوٹا موٹا بکری کا بچّہ آجاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اُس کی قیمت پانچ سات روپے ہو گی۔ آپ نے اسے اکھٹّے پچاس روپے تھما دیے!"

”ہاں میاں، تُم ٹھیک کہتے ہو۔ طوطا عموماً اِتنی ہی قیمت پر مل جاتا ہے، لیکن وہ طوطا پچاس روپے میں بھی مہنگا نہ تھا۔ سُنہری پروں والے طوطے نایاب ہیں۔“

”اچھا، اب ہمیں یہ بتایئے کہ وہ طوطا گُم کیسے ہوا؟“

”گُم نہیں ہوا، بلکہ چُرایا گیا۔“ نوّاب صاحب نے کہا۔ ”تین دِن پہلے کا ذکر ہے، میں اپنی عادت کے مطابق شام کو ہوا کھانے کے لیے نکلا۔ اتّفاق سے کمرے کا دروازہ اور کھڑکی کھُلی رہ گئی۔ جب میں سیر سے واپس آیا تو سنہری طوطا پنجرے سمیت غائب ہو چکا تھا۔ کچّی پگ ڈنڈی پر کار کے ٹائروں کے تازہ تازہ نشان دِکھائی دے رہے تھے۔ میرے پاس کار نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اندازہ کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوئی کہ کوئی شخص کار میں سوار ہو کر اِس عمارت کے اندر آیا اور طوطے کا پنجرا اُٹھا کر رفوچکّر ہو گیا۔ چوری کی واردات تھی اور پولیس کا فرض کہ وہ چور کو پکڑے، مگر افسوس کہ پولیس نے ایسا نہیں کیا۔“

"تعجّب ہے، بلکہ افسوس ہے۔" نسیم نے گردن مٹکا کر کہا۔ عنبر نے بڑی مُشکل سے ہنسی روکی اور نوّاب صاحب سے پوچھا:

"اب ہمیں اِس کالے کلوٹے موٹے آدمی کے بارے میں بتائیے جسے ہم نے اس عمارت میں دیکھا اور یہی سمجھتے رہے کہ ہماری ملاقات نوّاب جمشید علی خان سے ہوئی۔ کیا اُسی بدمعاش نے آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر یہاں ڈال دیا تھا؟"

"ہاں۔ یہ اُسی بدمعاش کی حرکت تھی۔" نوّاب صاحب نے جوش میں آ کر کہا۔ "پہلے پہل اُس نے مجھے بتایا کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ اپنا نام اُس نے مجھے سرفراز بیگ بتایا اور کہنے لگا کہ میں آپ کے گُم شدہ طوطے کی تلاش کے سلسلے میں آیا ہوں۔ اِس کے بعد وہ مجھ سے اُلٹے سیدھے سوال کرتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا کہ کیا پاس پڑوس میں آپ کے علاوہ کسی اور نے بھی اِس طوطے والے سے طوطا خریدا ہے؟ میں نے بتایا کہ ہاں ایک طرف بیگم مریم نے خریدا ہے جو اس مکان سے تیسرا مکان چھوڑ کر رہتی ہیں۔ یہ

سُنتے ہی اُس بد معاش کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ پھر میں نے اُسے بتایا کہ
جو طوطا میں خرید چکا ہوں، اگرچہ وہ بے حد خوب صُورت ہے لیکن ایک
عجیب بات کہتا ہے۔ یہ سُن کر وہ پہلے سے بھی زیادہ چوکنّا ہوا اور پوچھنے لگا
کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ طوطا عموماً کون سا فقرہ بار بار بولا کرتا ہے؟ میں
نے جواب دیا ہاں۔۔۔۔۔ وہ اکثر یہ فقرہ بولتا رہتا ہے کہ میرا نام سُنہری
خان ہے۔۔۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔۔۔ اور کون نہیں۔۔۔۔ میرا نام
سُنہری خان ہے۔۔۔۔۔ میں کون ہوں اور کون نہیں۔۔۔۔۔۔ اتنا سُننا
تھا کہ سرفراز بیگ اُچھل پڑا۔"

"نوّاب صاحب۔ یہ بتایئے کہ آپ نے سرفراز بیگ سے ذکر کیا تھا کہ وہ
طوطا ہکلاتا بھی ہے؟" عنبر نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ بات تو میں نے اُسے نہیں بتائی۔" نوّاب صاحب نے کچھ
سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "اُس وقت تک مُجھے شک نہیں ہوا تھا کہ یہ کوئی
اُچکّا یا اُٹھائی گیرا ہے اور اس کا کوئی تعلّق خفیہ پولیس سے نہیں۔ پھر اُس

نے مُجھ سے پوچھا کہ کیا طوطے بیچنے والے کے پاس سُنہری پروں والا کوئی اور طوطا تو نہیں تھا؟ تب مجھے یاد آیا کہ بے شک ایک ایسے رنگ کا طوطا بھی اُس کے پاس تھا جو کچھ بیمار نظر آرہا تھا۔ یہ سُن کر وہ اور چوکنا ہوا۔ تب مجھے سوچنا پڑا کہ آخر اِس خفیہ پولیس والے کو دوسرے طوطوں سے اتنی دل چسپی کیوں ہے؟ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ جھوٹا ہے۔ اُس کا تعلّق پولیس سے نہیں ہے، بلکہ کوئی بدمعاش آدمی ہے۔ پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ تُم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ بس یہ پوچھنا غضب ہو گیا۔ اس نے مُجھ حملہ کر دیا۔ تُم نے دیکھا ہو گا کہ وہ بڑا مضبوط اور طاقت ور آدمی تھا۔ میں بھلا اُس کا کیا مُقابلہ کرنا۔ جھٹ پٹ اُس نے مجھے بے بس کر کے رسّیوں میں جکڑ ڈالا اور منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ میں بڑی مُشکل سے گھُٹی گھُٹی آواز میں مدد کے لیے چلّایا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تم خود جانتے ہو۔“

عنبر اور نسیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ فکر نہ کریں۔ وہ

بدمعاش دوبارہ اِدھر نہ آئے گا۔ جہاں تک آپ کے طوطے کا تعلّق ہے، ہم اُسے تلاش کر کے آپ تک پہنچانے کی پوری کوشش کریں گے۔"

نوّاب جمشید علی خان نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور رُخصت کرنے کے لیے باہر تک آئے۔ اللہ داد ڈرائیور نے عنبر اور کو دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھول دیا۔ اتنی شان دار اور چمکیلی مرسیڈیز کار دیکھ کر نوّاب جمشید علی خان کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ انہوں نے دوبارہ عنبر اور نسیم سے ہاتھ ملایا اور واپس اپنے محل میں چلے گئے۔

گھر کی جانب جاتے ہوئے عنبر نے نسیم سے کہا۔ "اب ہمیں سب سے پہلے سرفراز بیگ کا سُراغ لگانا ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ اس نے نوّاب صاحب کا طوطا چُرانے کی کوشش کیوں کی۔ کوئی شخص محض ایک طوطے کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ دن دہاڑے محل میں گھُس جائے اور نوّاب کو رسّیوں میں جکڑ دے۔ پھر خود اُن کی جگہ لے کر آنے والوں سے ملاقات کرے اور آخر میں طوطے کو پنجرے سمیت لے کر بھاگ جائے۔

وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ تُم نے خود دیکھا ہے کہ سرفراز بیگ کے پاس نہایت قیمتی کار ہے اور جو سوٹ اُس نے پہن رکھا تھا، وہ بھی قیمتی تھا۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ اگر وہ چاہے تو ایسے بہت سے سُنہری طوطے بازار سے خرید سکتا ہے۔ پھر اُس نے نوّاب جمشید علی خان کا طوطا کیوں چُرایا؟"

"بے شک، اِس راز سے سرفراز بیگ ہی پردہ اُٹھا سکتا ہے۔" نسیم نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ داد! خبردار!" ایک دم عنبر کے چیخنے کی آواز سُنائی دی، لیکن اُسے چیخنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ اللہ داد پہلے ہی ہوشیار تھا۔ سامنے سے بھورے رنگ کی ایک بڑی کار کوئی پچاس میل کی رفتار سے آرہی تھی اور اس کا رُخ مرسیڈیز کی طرف تھا۔ اللہ داد نے بڑی پھُرتی سے اپنی کار ایک طرف کی اور بریکیں لگا دیں۔ بھورے رنگ کی کار کے ڈرائیور نے بھی بریکیں لگائیں، ٹائروں کے نیچے ایک زور دار آواز نکلی۔ دونوں گاڑیاں آمنے سامنے رُک گئیں۔ ان کے بمپروں کے درمیان مُشکل سے دو انچ کا

فاصلہ ہو گا۔ اگر بر وقت بریکیں نہ لگائی جاتیں تو خوف ناک ٹکّر ہو سکتی تھی۔

اللہ داد دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ بھورے رنگ کی گاڑی ایک چھوٹے قد کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اللہ داد کو اُترتے دیکھ کر وہ بھی اپنی گاڑی سے باہر آ گیا۔

"کیوں میاں، کیا نشہ کر کے گھر سے نکلے ہو؟" اللہ داد نے اُس سے کہا۔

"کیا ہمیشہ اِسی طرح گاڑی چلاتے ہو؟"

"بکواس بند کر، بندر کے بچے۔" چھوٹے قد کے ڈرائیور نے جواب دیا۔ اللہ داد کا چہرہ مارے غصّے کے سُرخ ہو گیا، لیکن اُس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا:

"ضرور تُم نشے میں ہو، بہر حال، اگر تم نے اب گالی بکی تو میں تمہارا جبڑا باہر نکال دوں گا۔"

"ابے جا۔ تُجھ جیسے بہت دیکھے ہیں جبڑا باہر نکالنے والے۔" دوسرا ڈرائیور

آستین چڑھاتے ہوئے چلّایا۔ "مارتے مارتے کچومر نکال دوں گا۔ ایک تو غلطی کی، اوپر سے غرّاتا ہے۔"

اللہ داد گھونسا تان کر اُس کی طرف بڑھا۔ دوسرے ڈرائیور نے جلدی سے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ شاید وہ چاقُو یا ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ اتنے میں بھُورے رنگ کی کار کا پچھلا ایک دروازہ کھُلا اور ایک لمبا چوڑا آدمی باہر نکل آیا۔ اُس نے بہت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔

"عبد الغفور۔۔۔۔۔! یہ کیا بد تمیزی ہے! چلو، واپس اپنی جگہ آؤ۔" اُس نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس کی آواز میں تیزی تھی اور لہجہ بھی عجیب سا تھا۔ عنبر اور نسیم نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کی سیاہ مونچھیں خاصی گھنی تھیں اور اُس نے اُس کی شخصیت کو خاصا بارُعب بنا دیا تھا، منہ کے پاس سیاہ رنگ کا ایک تِل بھی چمک رہا تھا۔

عبد الغفور نے اپنے مالک کا حکم سنا، لیکن اُس پر زیادہ توجّہ نہ دی۔ وہ اب بھی اللہ داد سے لڑنے مرنے پر تُلا ہوا تھا۔ مالک نے اُسے ایک اور گھر کی

دی تو وہ چُپ چاپ اپنی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ عنبر اور نسیم نے دیکھا کہ اُس بھوری کار میں ویسا ہی موٹا تازہ تڑنگا ایک تیسرا آدمی بھی موجود ہے جو پچھلی سیٹ پر بائیں جانب چُپ چاپ بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

مونچھوں والا آدمی لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا اللہ داد کے اور نزدیک آیا اور نرم آواز میں بولا:

”میں اپنے ڈرائیور کی بے ہودگی اور بد تمیزی کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ غلطی میرے ہی ڈرائیور کی ہے اور خدا نے اِس خوف ناک حادثے ہمیں بال بال بچایا۔ اب میں تمھارے مالک سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

اللہ داد کے جواب دینے سے پہلے ہی کار کا دروازہ کھول کر عنبر باہر نکل آیا اور کہنے لگا۔

”فرمایئے جناب، کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

مونچھوں والے نے حیرت سے عنبر کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا۔

”کیا آپ ہی اِس شان دار اور قیمتی مرسیڈیز کار کے مالک ہیں؟“

”جی ہاں، فی الحال میں ہی اِس کا مالک ہوں۔ یہ بات ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ کسی اور کی ہو جائے۔“

یہ گول مول جواب دینا ہی عنبر نے مناسب سمجھا۔ اللہ داد ڈرائیور بھی فوراً عنبر کی یہ مصلحت جان کر خاموش رہا۔ مُونچھوں والے نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد کہا۔

”کیا آپ نوّاب جمشید علی خاں صاحب کو جانتے ہیں؟ میں دراصل اِس جگہ اجنبی ہوں۔ اِس وقت اُنہی سے ملاقات کے لیے جا رہا تھا۔ اگر آپ مہربانی کر کے۔۔۔۔“

”جی ہاں۔ میں اُنہیں خوب جانتا ہوں۔“ عنبر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”نوّاب جمشید علی خان بہت مشہور آدمی ہیں۔ سارا شہر اُنہیں جانتا پہچانتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم انہی کے پاس بیٹھے تھے۔“

”آہا! تب تو آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔“ مونچھوں والے نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ بتا سکتے ہیں کہ نوّاب صاحب کے پالتو طوطے سُنہری خان کا کیا حال ہے؟“

اب عنبر نے حیرت سے اُس آدمی کو دیکھا۔ شاید اِسے بھی اُس طوطے سے کچھ دل چسپی ہے۔ اُس نے دل میں کہا۔ پھر مُسکراتے ہوئے جواب دیا:

”جناب، سُنہری خان گُم ہو چکا ہے، یا یُوں کہیئے اُسے ایک شخص نوّاب صاحب کی حویلی سے پنجرے سمیت اُڑا لے گیا۔ ابھی تک طوطے یا اُس چور کا کوئی پتا نہیں چلا۔ نوّاب صاحب بے حد رنجیدہ ہیں اور اُنہوں نے طوطے کی تلاش کے لیے پانچ ہزار روپے انعام کا اعلان بھی کیا ہے۔ پولیس نے بھی اُسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ناکام رہی۔“

”نوّاب صاحب کا طوطا چُرالیا گیا!“ مُونچھوں والے کا چہرہ ایک دم یہ خبر سُنتے ہی اُتر گیا۔ ”بھئی، مُجھے بھی اِس خبر نہایت صدمہ ہوا۔ تعجّب

ہے۔۔۔۔وہ طوطا۔۔۔۔“

وہ کُچھ کہتے کہتے رُک گیا اور غور سے عنبر کی طرف دیکھنے لگا۔ ”معاف کرنا۔۔۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ پھر کبھی ملاقات ہو گئی۔ میں خاص طور پر نوّاب جمشید علی خان کے طوطے کی تعریف سُن کر اُسے دیکھنے آیا تھا، لیکن اب وہاں جا کر کیا کروں گا؟ خدا کرے اُن کا طوطا مِل جائے۔“

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اپنا نام اور پتا بتائے بغیر، کار میں بیٹھ گیا۔

”عبد الغفور! واپس ہوٹل کی طرف چلو۔“ اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ عبد الغفور ابھی تک سُرخ سُرخ آنکھوں سے اللہ داد کو گھُور رہا تھا۔ اپنے مالک کا حکم پاتے ہی اُس نے کار کا انجن سٹارٹ کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ عنبر واپس آن کر مرسیڈیز میں بیٹھ گیا۔ نسیم نے کہا۔ ”یہ کون لوگ تھے؟ آخر اُنہیں نوّاب صاحب کے طوطے کی اتنی فکر کیوں پڑ گئی؟ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ہر شخص اس شہری طوطے کے

چکّر میں ہے۔"

"اس کے پیچھے ضرور کوئی گہرا راز ہے۔ یہ معاملہ ہر لمحے زیادہ دل چسپ اور پُراسرار ہوتا جارہا ہے۔" عنبر نے جواب دیا۔

"میاں، اب کِدھر چلوں؟" اللہ داد پوچھ رہا تھا۔

"گھر کی طرف ہی چلو۔ اب اور کہاں جائیں گے۔" نسیم نے اُسے ہدایت کی۔ اللہ داد نے کار موڑ دی اور گھر جانے والی سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عنبر نے کہا:

"مجھے یقین ہے کہ اُس مُونچھوں والے آدمی کی کار کا ڈرائیور اچھّا آدمی نہیں تھا۔ اُس کی حرکتیں بدمعاشوں کی سی تھیں۔ غالباً اُس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں پستول یا ریوالور بھی چھُپا رکھا تھا۔"

"ہاں میاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" اللہ داد نے کہا۔ "وہ کوئی بدمعاش ہی تھا۔ ویسے میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر اُس نے ذرا چیں چپڑ کی

تو اِتنا ماروں گا کہ بیٹا کو چھٹی کا دُودھ یاد آ جائے گا۔ میں نے بڑے بڑے بد معاشوں کو سیدھا کر دیا ہے۔ پستول وستول سب دھرا رہ جاتا۔"

عنبر نے پوچھا۔ "نہتا آدمی ہتھیار والے کا مُقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟"

"میاں، میں نے کُچھ عرصہ جوڈو کراٹے کا فن بھی سیکھا ہے۔ پہلوانی کے داؤ پیچ بھی خوب جانتا ہوں۔ ایسے ایسے دس بھی آ جائیں تو انشا اللہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔"

"بھئی، واہ وا! تُم تو بہت کام کے آدمی نکلے۔" نسیم نے کہا۔ "فرصت میں یہ جوڈو کراٹے کا فن ہمیں بھی سکھانا۔ سُنا ہے یہ بہت کار آمد چیز ہے۔"

"جی ہاں، بہت کار آمد ہے۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اس کے چند ضروری داؤ پیچ سکھا دوں گا۔" اللہ داد نے وعدہ کیا۔

چند لمحے میں خاموشی سے سفر ہوتا رہا۔ عنبر کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا اور نسیم خیال ہی خیال میں جوڈو کراٹے کے ذریعے اپنے دُشمنوں کی ہڈّیاں

پسلیاں توڑ رہا تھا۔ یکایک اللہ داد نے گاڑی روک دی۔

”کیا ہوا، اللہ داد؟“ عنبر نے اپنے خیالوں سے چونک کر کہا۔ ”کیا پیٹرول ختم ہو گیا یا انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اللہ داد نے جواب دیا۔ ”سڑک کے عین بیچوں بیچ ایک خاتون راستہ روکے کھڑی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اُن کی کوئی چیز کھوئی گئی ہے۔“

نسیم اور عنبر نے گردن اُونچی کر کے سڑک کا جائزہ لیا۔ ایک چھوٹے قد کی، موٹی تازی عورت واقعی سڑک کے درمیان میں حیران پریشان کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے اُگی ہوئی گھاس کی طرف بھاگتی، کبھی واپس آن کر دوسری جانب جاتی۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ بڑبڑاتی بھی جاتی تھی۔ اُسے ٹریفک کا کوئی خیال ہی نہ تھا۔ تیز رفتار گاڑیاں فرّاٹے بھرتی ہوئی اُس کے قریب سے گزر رہی تھیں۔

”ممکن ہے ہم اس عورت کی کوئی مدد کر سکیں۔“ عنبر نے کار کا دروازہ

کھول کر اُترتے ہوئے کہا۔ نسیم بھی اُس کی دیکھا دیکھی نیچے اُتر آیا۔ پھر وہ دونوں اُس عورت کے نزدیک پہنچے۔ اللہ داد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک کے کنارے لا کھڑی کی۔ اُس وقت وہ عورت سڑک سے کُچھ فاصلے پر گھنی جھاڑیوں میں گھُسی ہوئی کسی کو آوازیں دے رہی تھی۔

"آؤ۔۔ آؤ!۔۔۔۔ شاباش۔۔۔۔۔! آ جاؤ! دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔۔۔۔۔۔ اب آ بھی جاؤ۔۔۔۔۔ زیادہ تنگ نہ کرو۔۔۔۔"

"محترم خاتون، معاف کیجیے۔ آپ کُچھ پریشان نظر آتی ہیں۔" عنبر نے کہا۔ "کیا ہم آپ کے کسی کام آسکتے ہیں؟"

عورت نے گھُوم کر حیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور بولی:

"کیا تُم لوگوں نے میرے پُوپُو کو دیکھا ہے؟"

"نہیں محترمہ، ہم نے آپ کے پُوپُو کو نہیں دیکھا۔" عنبر نے جواب دیا۔ "ویسے میرا اندازہ ہے کہ پُوپُو آپ کے پالتو طوطے کا نام ہو گا؟" اس

عورت کو اور حیرت ہوئی۔

"خُدا کی پناہ! بھلا تُم نے کیسے بُوجھا کہ۔۔۔۔۔؟"

عنبر نے اُس کی بات کاٹ کر اُس پنجرے کی طرف اشارہ کیا جو گھاس کے اندر ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ "اُس پنجرے میں ظاہر ہے کہ کوئی طوطا ہی بند تھا۔ اب آپ مہربانی کر کے ہمیں بتایئے کہ پُوپُو گُم کیسے ہوا؟ ممکن ہے ہم اُس کی تلاش میں آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔"

عورت کی حیرت بڑھتی ہی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُس نے کہا۔ "لڑکو! تُم نے مُجھے حیران کر دیا ہے۔ اگر تُم میرے گھر چلو تو میں اپنے پُوپُو کے کھو جانے کی کہانی سُناؤں گی۔ یہ عجیب کہانی ہے۔"

عنبر نے ہاتھ کے اشارے سے اللہ داد کو کار وہیں لانے کے لیے کہا۔ چند لمحوں بعد وہ موٹی عورت کو کار میں بٹھا کے اُس کے گھر کی طرف جارہے تھے۔ کیلوں کے درختوں کے ایک خوب صورت جھُنڈ کے پیچھے اُس کا گھر تھا۔ عورت نے انہیں چھوٹے سے صاف سُتھرے کمرے میں بٹھایا اور

جھٹ پٹ ٹھنڈا شربت بنا کر لے آئی۔ عنبر نے شربت کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا:

"بیگم مریم، آپ نے یہ طوطا شاید اُس شخص سے خریدا تھا جو آج سے تقریباً تین ہفتے پہلے گدھا گاڑی پر آیا تھا۔ گدھا گاڑی پر طوطوں کے پنجرے دھرے ہوئے تھے اور آپ نے نوّاب جمشید علی خان کو بھی طوطا خریدنے کا پیغام بھیجا تھا؟"

بیگم مریم کا منہ کھُل گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "لڑکو! تُم تو غضب کرتے ہو۔" انہوں نے کہا۔ "یہ سب باتیں تمھیں کیسے معلوم ہوئیں! تم جن بھوت تو نہیں ہو؟"

عنبر اور نسیم ہنس پڑے۔ نسیم نے جلدی سے کہا۔ "جی ہاں۔۔۔۔۔ میں بھوت ہوں اور میرا یہ ساتھی جِن ہے بہت خوف ناک قسم کا جِن۔ دیکھیے، ابھی یہ دھواں بن کر ہوا کے ساتھ اُڑے گا۔"

"ہائے اللہ!" بیگم مریم نے ڈر کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "بھئی، سچ سچ بتاؤ تُم

لوگ ہو کون؟"

"کہا تو ہے کہ میں بھُوت ہوں، یہ جن۔" نسیم نے کہا۔

"بیگم صاحبہ میرا یہ دوست بہت مسخرا ہے۔" عنبر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کی بات کا بُرا نہ مانیے گا۔ میرا نام عنبر ہے اور اِس کا نسیم۔ ہمارا ایک ساتھی اور بھی ہے جسے عاقِب کہتے ہیں۔ در اصل ہمیں سُراغ رسانی کا شوق ہے۔ ہمیں آپ کا نام نوّاب جمشید علی خان صاحب ہی نے بتایا تھا۔ ہم اُن کا سُنہری طوطا ڈھونڈ کر پانچ ہزار روپے انعام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم آپ کا پُوپُو بھی ڈھونڈ لیں تو آپ کیا انعام دیں گی؟"

"انعام ضرور دوں گی، لیکن پانچ ہزار نہیں، صرف پانچ روپے۔" بیگم مریم نے مُسکرا کر کہا۔ "خیر، اب پُوپُو کے گُم ہونے کا قصّہ سُنو۔ آج صُبح میں اپنے گھر کے لیے چند ضروری چیزیں خریدنے اسٹور کی طرف گئی۔ پُوپُو کا پنجرا سُورج مکھّی کے پھُولوں کے پاس باغیچے میں رکھ دیا۔ اُسے یہ پھول بہت پسند ہیں۔ ابھی میں سڑک پر دو چار قدم ہی چلی تھی کہ سُرخ رنگ کی

ایک نئی سپورٹس ماڈل کا تیزی سے آئی۔ اگر میں اُچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتی تو کار مجھے کچلتی ہوئی نِکل جاتی۔ خُدا جانے آج کل لوگ کار اتنی بے پروائی اور تیز رفتاری سے کیوں چلانے لگے ہیں۔ پلک جھپکتے میں وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔"

نسیم اور عنبر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا سُنا۔ سُرخ رنگ کی سپورٹس ماڈل کار۔۔۔۔ اور اُس کا مالک یا ڈرائیور اُن کی نظروں کے سامنے آ گیا، لیکن اُنھوں نے فی الحال اُس کا ذکر بیگم مریم سے کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"خُدا کا شکر ہے، آپ بچ گئیں۔" عنبر نے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"میں اسٹور میں گئی۔ ضرورت کی چیزیں خریدیں، پُوپُو کے لیے امرُود اور ہری مرچیں لیں اور گھر واپس آئی۔ باغیچے میں جاتے ہی دل دھک سے ہو گیا۔ پُوپُو کے پنجرے کی کھڑکی کھُلی تھی اور پُوپُو ندارد تھا۔ میں نے خیال کیا کہ ہو سکتا ہے کسی وجہ سے کھڑکی کھُلی رہ گئی ہو اسر مُجھے تنگ کرنے کے

لیے باغیچے میں کہیں چھُپ گیا ہو۔ میں نے اُسے بہت سی آوازیں دیں، لیکن کوئی جواب نہ ملا، پھر میں اُس کی تلاش میں سڑک کے کنارے اُگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس تک چلی گئی۔۔۔۔"

"بیگم صاحبہ، یہ بتایئے کہ جس کار سے آپ کا حادثہ ہونے والا تھا، اُسے دوبارہ تُو آپ نے نہیں دیکھا۔"

"نہیں۔ وہ دوبارہ مُجھے نظر نہیں آئی۔" بیگم مریم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہارا خیال ہے، وہی آدمی موقع پا کر میرے گھر میں گھُسا اور پُوپُو کو پنجرے سے نکال کر لے گیا؟ لیکن اُسے بھلا طوطے چُرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے، بیگم صاحب۔" عنبر نے کہا۔ "اُسی شخص نے نوّاب جمشید علی خان کا سُنہری طوطا چُرایا اور پھر موقع پا کر آپ کا طوطا بھی لے گیا۔"

"لیکن۔۔۔۔ ایسے ایسے ہزاروں طوطے وہ خود بھی خرید سکتا ہے۔" بیگم

مریم نے کہا۔ ”جس شخص کے قبضے میں اتنی قیمتی کار ہو، کیا وہ طوطے خرید نہیں سکتا؟“

”ضرور خرید سکتا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو طوطے اُس نے چُرائے ہیں اُن میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ نوّاب جمشید علی خان کو اُس شخص نے اپنا نام سرفراز بیگ بتایا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ نام بھی فرضی ہو۔ بہر حال، آپ دھیان رکھیے۔ اگر آئندہ وہ بدمعاش کہیں دکھائی دے تو فوراً پولیس کو اِطّلاع دیجیے۔“

”پولیس؟“ بیگم مریم نے گھبرا کر کہا۔ ”نا بابا نا۔ میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔ ہاں، تم لوگ اگر طوطا ڈھونڈ کر لانے کا وعدہ کرو تو تمھیں اس شخص کے بارے میں ضُرور اِطّلاع دوں گی، بشرطیکہ وہ دوبارہ نظر آ جائے۔“

”چلیے، ایسا ہی سہی۔“ عنبر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ پھر جیب سے مُلاقاتی کارڈ نکال کر اُنھیں دیا۔ ”اس پر ہمارے نام لکھے ہیں۔ پچھلی طرف آپ ہمارا

خاص فون نمبر لکھا پائیں گی۔ لیکن یہ نمبر کسی کو ہماری اجازت کے بغیر نہ بتائیے گا۔ اچھّا، اب اجازت دیجیے۔ موقع ملا تو ہم خود آپ سے رابطہ قائم کریں گے۔"

بیگم مریم کو خُدا حافظ کہہ کر وہ دونوں باہر آ گئے۔ نسیم نے کہا۔ "اب تو یہ قصّہ اور اُلجھ گیا۔ مجھے حیرت ہے کہ اِس کم بخت سرفراز بیگ کو طوطے چُرانے کی سوجھی کیوں۔ میرا تو خیال ہے وہ پاگل ہے۔"

عنبر مُسکرایا۔ "نہیں میرے دوست، وہ پاگل نہیں۔ بہت خطرناک مجرم ہے اور اِن طوطوں کے پیچھے کوئی زبردست راز چھپا ہوا ہے۔ یہی بات میں بار بار دہراتا ہوں سرفراز بیگ جیسا شخص خواہ مخواہ لوگوں کے طوطے نہیں چُرا رہا ہے۔ خبردار۔۔۔۔۔! بچو۔۔۔۔۔! پرے ہٹ جاؤ۔۔۔!" ایک دم اُس نے نسیم کو پرے دھکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں اُڑاتی ہوئی کوئی چیز آئی اور اُن کے سروں سے ہوتی ہوئی گھاس میں جا گری۔ عنبر جلدی سے زمین پر لیٹ گیا ورنہ اُس کا سر پھٹ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد

اُنھوں نے اُٹھ کر اُس چیز کو دیکھا۔ یہ سُرخ رنگ کے ٹائل کا ایک ٹکڑا تھا جیسے کِسی نے اُن کے اُوپر کھینچ مارا تھا۔ عنبر نے اِرد گرد دیکھتے ہوئے کہا:

"یہ ٹکڑا سامنے سے آیا تھا۔ اُدھر، جھاڑیوں کی طرف سے۔ ضُرور وہاں کوئی چھُپا ہوا ہمارا انتظار کر رہا تھا، لیکن کسی کو کیا ضرورت تھی ہم پر حملہ کرنے کی؟"

"خُدا کی قسم اگر یہ میرے لگ جاتا تو میں پانی بھی نہ مانگتا۔" نسیم نے کہا۔ "کیا تُم نے نہیں دیکھا کہ پھینکنے والا کون تھا؟"

"افسوس کہ میں اُسے نہیں دیکھ سکا۔" عنبر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر ناخُن سے نِچلا ہونٹ نوچنے لگا۔

کار کا نمبر

اپنے ہیڈ کوارٹر میں تینوں ننّھے سُراغ رساں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ عنبر اور نسیم نے تیسرے سُراغ رساں عاقِب کو اب تک کے تمام واقعات بتا دیے تھے اور اس بات پر سوچ بچار ہو رہا تھا کہ آئندہ کیا قدم اُٹھایا جائے۔

یکا یک اُن کے ٹیلے فون کی گھنٹی بجی۔ تینوں چونک کر فون کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر عنبر نے آگے بڑھ کر ریسیور اُٹھایا۔ اُس کے ساتھ اُس نے اُنگلی سے ایک بٹن دبایا۔ یہ بٹن اس اسپیکر کا تھا جس کا سلسلہ اُنھوں نے فون

کے ساتھ جوڑ رکھا تھا تاکہ سبھی سُراغ رساں فون پر ہونے والی گفتگو سن سکیں۔

"ہیلو۔۔۔۔۔ ہے لو!" عنبر کے کانوں میں ایک لڑکے کی آواز آئی۔
"آپ کہاں سے بول رہے ہیں جناب؟"

"میرا نام عنبر ہے اور میں اپنے ہیڈ کوارٹر سے بول رہا ہوں، تُم کون ہو؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، یہی نام مُجھے بتایا گیا تھا۔" آواز آئی۔ "میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟ ایک ضروری بات بتاؤں گا، آپ کو۔"

عنبر نے کہا۔ "وہ ضروری بات فون پر نہیں بتائی جا سکتی؟"

"جی نہیں۔" جواب ملا۔

"بہت بہتر۔ میں تمہیں اپنے مکان کا پتا سمجھاتا ہوں۔ غور سے سُنو۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا پتا بتایا اور پُوچھا۔ "سمجھ گئے؟ اب تم کتنی دیر میں

یہاں پہنچ رہے ہو؟ ہم تمہیں اپنے مکان کے باہر ہی ملیں گے۔"

"بس آدھ گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔" آواز آئی۔ "آپ میرا انتظار کریں۔ خُدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" عنبر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

نسیم اور عاقِب کے چہروں پر بہت بڑا سوالیہ نشان بنا ہوا تھا اور وہ جواب پانے کے لیے عنبر کی طرف رہے تھے۔ عنبر نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یوں گھور کر کیا دیکھتے ہو؟ ابھی آدھ گھنٹے بعد یہ راز کھُل جائے گا کہ وہ ہم سے کیوں ملنا چاہتا ہے اور کون سی ضروری بات ہمیں بتانے کا خواہش مند ہے۔"

"اُس لڑکے کی آواز سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔" عاقِب نے کہا۔

"بے شک یہ اندازہ درست ہے۔ میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔" نسیم

نے گردن ہلا کر کہا۔ ”وہ کوئی ایسا لڑکا ہے جو پھیری پر آواز لگا لگا کر چیزیں بیچتا ہے۔“

”لیکن سوال یہ ہے کہ اسے بھلا ہم سے کیا کام ہو گا۔“ عاقِب نے پوچھا۔ ”پھر یہ بات بھی ہے کہ اُسے ہمارے ہیڈ کوارٹر کا فون نمبر کس نے دیا؟“

اسی بحث میں آدھ گھنٹا گزر گیا اور وہ تینوں وہاں سے اُٹھ کر باہر سڑک پر آن کھڑے ہوئے۔ سڑک دُور تک سُنسان پڑی تھی۔ کبھی کبھار اِکّادُکّا راہ گیر یا کوئی گاڑی اُدھر سے گُزر جاتی تھی۔

”ممکن ہے کسی نے مذاق کیا ہو۔“ نسیم نے اچانک کہا۔ ”ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہو۔“

تھوڑی دیر بعد دُور سے انہیں ایک چھوٹی سی گدھا گاڑی آتی دکھائی دی۔ گدھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اُسے لڑکوں تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔ گاڑی کے اُوپر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے چودہ پندرہ برس کا ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ اُن کے نزدیک گاڑی روک کر وہ اُترا اور بے وقوفوں کی طرح پلکیں

جھپکاتا ہوا تینوں کو باری باری دیکھنے لگا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ہی فون کیا تھا؟" عنبر نے اُسے اُوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔۔۔ ہاں جی۔۔۔۔۔ میں نے۔۔۔۔۔ ہی کیا تھا۔" لڑکے نے کُچھ خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"بولو کیا ضروری بات کہنا چاہتے تھے تم؟" نسیم نے کہا۔

لڑکا اب پریشان ہو کر نسیم کی طرف تکنے لگا۔ عنبر نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آؤ، اندر آ جاؤ۔ ڈرو مت، ہم تمھیں کُچھ نہیں کہیں گے۔ اپنی گدھا گاڑی بھی اندر لے آؤ۔"

کچھ ہچکچا کر اُس غریب لڑکے نے مکان کے اندر آنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر اپنے گدھے کو تھپکی دے کر بولا۔ "آؤ راجا۔۔۔ اندر چلیں۔۔۔ وہاں ہری ہری گھاس تمھیں کھانے کو ملے گی۔"

”ہاں۔۔۔۔ جس قدر جی چاہے گھاس کھاؤ۔“ نسیم نے ہنس کر کہا۔ ”جی چاہے تو گھر بھی لے جانا؟“

لڑکے نے اِس فقرے پر بُرا سا منہ بنایا۔ ظاہر ہے اُسے نسیم کا یہ مذاق پسند نہیں آیا تھا۔ عنبر نے اُسے آنکھ کے اشارے سے منع کیا کہ ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے یہ لڑکا پریشان ہو یا بُرا مانے۔ نسیم محتاط ہو گیا۔

”میرا نام محمّد دین ہے، اور یہ گدھا گاڑی میرے چچا کی ہے۔ وہ اِس پر طوطوں، کبوتروں اور رنگ برنگ چڑیوں کے پنجرے لاد کر گلی گلی کوچے کوچے بیچتا پھرتا ہے۔ جب اُس کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو یہ کام میں کرتا ہوں۔“

”آہا۔۔۔۔ یہ تو عجیب بات بتائی تم نے محمّد دین۔“ عنبر نے کہا۔ ”تم نے بہت اچھا کیا کہ یہاں آ گئے ورنہ ہمیں خود تمہاری تلاش میں نکلنا پڑتا۔“

محمّد دین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گردن ہلائی۔ تینوں لڑکے اُسے اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے اور اُسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے چارہ

کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہچکچایا، لیکن عنبر نے اُسے زبردستی بٹھا دیا۔ پھر اُنہوں نے میز کی دراز کھول کر بسکٹ نکالے اور اُس کے سامنے رکھ دیے۔ ''لو کھاؤ، اور اب اطمینان سے بتاؤ کہ تم ہم سے ایسی کون سی ضروری بات کہنا چاہتے تھے۔'' عنبر نے کہا۔

محمّد دین نے جواب دینے سے پہلے دو تین بسکٹ کھائے پھر باری باری اُن تینوں کو دیکھتے ہوئے بولا:

''آج صُبح ایک شخص مجھے ملا۔ وہ لال رنگ کی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے دس روپے کا نوٹ دیا اِس کے ساتھ یہ کاغذ بھی تھا۔ پھر اُس نے مجھے آپ کا نمبر بتایا اور مُسکرا کر کہنے لگا کہ اِس نمبر پر فون کر کے کہنا کہ میں تُم سے ملنا چاہتا ہوں اور جب وہ تمہیں بلائیں تو یہ کاغذ انہیں دے دینا۔ ابھی میں کچھ جواب دینے نہ پایا تھا کہ وہ کار لے کر غائب ہو گیا۔''

''دکھاؤ یہ کاغذ۔'' نسیم نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔ اس پر صرف اتنا لکھا تھا:

AK 4513

نسیم نے کاغذ عنبر کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ”اُسی کار کا نمبر اِس پر لکھا ہے۔ خُدا کا شُکر ہے کہ ہم ایک بڑی پریشانی سے بچ گئے ورنہ اِس کار کو ڈھونڈنا آسان نہ تھا۔“

عنبر نے غور سے کاغذ پر لکھا ہوا یہ نمبر دیکھا۔ پھر بولا۔ ”ضروری تو نہیں کہ یہ نمبر اُسی سُرخ اسپورٹس کار کا ہو۔ کیا تُم اس کے آخر میں تین کا ہندسہ دیکھ کر یہ بات کہہ رہے ہو؟“

”ہاں۔ اس طرف تو میرا دھیان گیا ہی نہیں۔“ نسیم نے اقرار کیا۔ ”یہ نمبر ہمیں دھوکا دینے کے لیے غلط بھی لکھا جا سکتا ہے۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ نمبر بالکل درست ہو۔“ سُراغ رساں نمبر تین عاقِب ایک دم بول پڑا۔ ”مُجرم اتنا چالاک اور نڈر ہے کہ اُس نے محمّد دین کو نہ صرف ہمارا فون نمبر دیا، بلکہ اپنی کار کا صحیح نمبر دے کر ہدایت کی کہ وہ ہم تک پہنچا دے۔ دوسرے معنوں میں اُس نے ہمیں چیلنج کیا ہے کہ ہمّت

ہے تو آؤ اور مجھے پکڑو۔"

"زندہ باد۔" نسیم چلّایا۔ "یار عاقِب، خدا تمھیں بُری نظر سے بچائے۔ اب تو تم بھی ذہانت کی باتیں کرنے لگے ہو۔"

"خیر خیر، یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔" عنبر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "میں اس وقت بے حد سنجیدہ ہوں۔ جیسا کہ عاقِب نے خیال ظاہر کیا ہے، اگر مجرم نے واقعی ہمیں چیلنج کیا ہے تو پھر ہمیں بھی کمر کس لینی چاہیے۔ جہاں تک اس کار کے نمبر کا تعلّق ہے، اُس کے صحیح یا غَلَط ہونے کا پتا چلانا کچھ دشوار نہیں۔ پولیس چند گھنٹوں میں سُراغ نکال لے گی، لیکن فی الحال ہم اس معاملے میں پولیس کو نہیں لائیں گے۔ اچھا محمّد دین، یہ بتاؤ اُس کار والے نے آخر تمھی کہ اِس کام کے لیے کیوں چُنا؟"

"شاید اس لیے کہ وہ مجھے پہلے سے جانتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ میرے چچا خُدا بخش سے طوطے بھی خریدنے آیا تھا۔"

"کیا تمھارے چچا ہی نے نوّاب جمشید علی خان اور بیگم مریم کے ہاتھ طوطے

بیچے تھے؟" عنبر نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ وہ بڑے قیمتی اور خوب صُورت طوطے تھے۔" محمّد دین نے جلدی سے کہا۔ "میرا چچا اپنے طوطوں کے عجیب عجیب نام رکھا کرتا ہے۔"

"مثلاً، کون کون سے نام؟" نسیم نے پوچھا۔

"نوّاب جمشید علی خان کے ہاتھ جو طوطا میرے چچا نے بیچا، اُس کا نام سُنہری خان تھا، اور بیگم مریم کو جو طوطا دیا اُسے پُوپُو کہتے ہیں۔" محمّد دین نے بتایا۔ "ان کے علاوہ ایک طوطے کا نام تھا بہرام اور ایک کا سلطانہ۔"

"ارے۔" نسیم نے ایک دم کہا۔ "بہرام اور سُلطانہ تو ڈاکوؤں کے نام تھے۔"

"مُجھے خبر نہیں کہ یہ نام ڈاکوؤں کے ہیں یا نہیں۔ میرے چچا کو اپنے طوطوں کے ایسے ہی نام رکھنے کا شوق تھا۔" محمّد دین نے جواب دیا۔ "ہاں،

اور نام یاد آئے۔ ایک کا نام اُس نے کپتان باز بہادُر اور ایک کا بُزدل کانا بھی رکھا تھا۔"

"بُزدل کانا؟ طوطے کا نام؟" عنبر نے حیرت سے کہا۔ "ہاں جی۔ وہ بڑا ڈرپوک طوطا تھا، اور بے چارہ ایک آنکھ سے کانا تھا۔ پھر بھی وہ بِک ہی گیا۔"

عاقِب نے جھٹ پٹ اِن تمام طوطوں کے نام اپنی ڈائری میں درج کر لیے۔

"یہ کُل چھے طوطے ہوئے۔ اِن کے علاوہ تمہارے چچا کے پاس اور بھی طوطے تھے؟" عاقِب نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کالے رنگ کا ایک افریقی نسل کا طوطا بھی تھا۔ اس کا نام کالا ڈاکو رکھا گیا تھا۔ ویسے تھا بڑا قیمتی۔ بہت بولتا تھا۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ کالے ڈاکو سوا تمام طوطوں کے سر زرد رنگ کے تھے۔"

عاقِب نے جلدی سے یہ کام کی بات بھی اپنی ڈائری میں نوٹ کرلی۔

"غالباً یہ وہی سُرمئی پروں والا طوطا ہوگا جس کا ذکر، نوّاب جمشید علی خان نے کیا تھا۔" نسیم نے عنبر سے کہا۔

"ہاں، بالکل وہی۔ اور جس کا ذکر سُنتے ہی سرفراز بیگ چوکنّا ہو گیا تھا۔" عنبر نے جواب دیا۔ "بہر حال، اب یہ قصّہ کچھ اور پُر اسرار ہو گیا ہے۔ ایک دو نہیں، اکٹھے سات طوطے اس میں پھنس گئے ہیں۔ ہاں تو محمّد دین، یہ لال کار والا موٹا تازہ آدمی طوطے خریدنے تمہارے چچا کے پاس آیا تھا؟"

"ہاں جناب۔ آج سے کوئی سات آٹھ دن پہلے کی بات ہے، وہ میرے چچا کے پاس آیا اور طوطے خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن افسوس کہ اُس وقت تک تمام طوطے بِک چُکے تھے۔ چچا نے اُس سے کہا کہ اِس وقت کوئی طوطا نہیں ہے۔ جب نئے طوطے آ جائیں گے تب خرید لیجیے گا۔ چچا کی یہ بات سُن کر وہ بے حد مایوس ہوا اور اُن سے پوچھنے لگا کہ تُم نے وہ طوطے کس

کس کے ہاتھ اور کہاں کہاں بیچے ہیں؟ چچا بے چارے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور یُوں بھی اُن کی یادداشت کم زور ہے۔ وہ اُس آدمی کے رویّے سے ڈر گئے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اُنھیں کچھ یاد نہیں ہے، ہاں، ایک طوطا نوّاب جمشید علی خاں کے ہاتھ بیچا اور ایک بیگم مریم نے خریدا تھا۔ باقی خریداروں کے نام یاد نہیں رہے۔"

"اب میں سمجھا کہ وہ بدمعاش کس لیے طوطے چُراتا پھِر رہا ہے۔" عنبر نے کہا۔ "ضرور اِن طوطوں سے کوئی خاص راز وابستہ ہے، بہر حال، اب ہمیں بھی طوطوں کو ڈھونڈنا ہو گا۔ یعنی اُن پانچ بقیہ طوطوں کو جنھیں شاید اب تک وہ نقلی نوّاب سر فراز بیگ ڈھونڈ نہیں پایا ہے۔"

"اور میرے خیال میں اُن طوطوں کو تلاش کرنے کے لیے اتنے بڑے شہر میں ہمیں کم از کم پانچ برس تو لگ ہی جائیں گے۔ ایک طوطا ایک برس کے حساب سے۔" نسیم نے کہا۔ عنبر اور عاقِب ہنس پڑے۔ محمّد دین مُسکرا دیا۔ عنبر نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”محمّد دین، تم آج سے ہمارے دوست ہو۔ تم نے بہت مفید اور اچھّی خبریں دی ہیں۔ کبھی کبھی یہاں آجایا کرو اور دیکھو، جوں ہی وہ موٹا، لال کار والا، دوبارہ نظر آئے، اُس کا پتا لگانے کی کوشش کرنا۔“

محمّد دین نے اقرار میں گردن ہلائی۔ عنبر نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اُسے دیا۔ ”یہ رکھ لو آئندہ بھی انعام دیتے رہیں گے۔“

محمّد دین، کسی گہری سوچ میں گُم تھا۔ عاقِب نے کہا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟ روپے کم ہیں تو ایک دو مجھ سے اور لے لو۔“

محمّد دین نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جی، میں یہ نہیں سوچ رہا ہوں۔ مجھے یاد آگیا کہ جب وہ موٹا آدمی مایوس ہو کر ہمارے گھر سے جا رہا تھا تو اُس نے چچا کو ایک چھوٹا سا کارڈ دیا تھا اور کہا تھا کہ اِس پر میرا نام اور پتا لکھا ہے۔ جوں ہی اُن ساتوں طوطوں کے بارے میں تمھیں یاد آجائے کہ کِن کِن کے ہاتھ بیچے تھے، مجھے فوراً اِطّلاع کرنا۔ میں تمھیں معقول انعام دوں گا۔“

”واہ وا! یہ تو بہت اچھّا ہوا۔“ نسیم نے کہا۔ ”کیا تم۔ وہ کارڈ ہمیں لا کر دے سکتے ہو؟“

”ہاں ہاں، ابھی گھر جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ کارڈ چچا نے ایک طاقچے میں رکھ دیا تھا۔ ابھی تک وہیں پڑا ہو گا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میں واپس آتا ہوں۔“

”جاؤ، شاباش! تم واقعی بہت کام کے نکلے۔“ عنبر نے اُس کی پیٹھ تھپکی۔ ”ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تم وہ کارڈ لے کر آؤ گے تو کچھ اور انعام بھی دیں گے۔“

اُنہوں نے محمّد دین اور اُس کی گدھا گاڑی کو دروازے تک پہنچایا اور واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔ ابھی انہوں نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ پرائیویٹ فون کی گھنٹی بجی۔ عنبر نے جھپٹ کر رسیور اُٹھایا۔

”ہیلو!“ کسی عورت کی آواز کان میں آئی۔ ”کون بول رہا ہے۔“

"میں عنبر۔"

"دیکھ لڑکے۔۔۔۔۔ ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر اپنا کام کر۔ ایسا نہ ہو کہ ہڈّی پسلی ٹوٹ جائے۔" عورت نے کہا۔ "سرفراز بیگ کے پیچھے مت پڑ۔۔۔۔۔ وہ بہت بُرا آدمی ہے۔ اُس کے کاموں میں دخل دے گا تو نقصان اُٹھائے گا۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

تینوں لڑکے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ ریڈیو والے اسپیکر سے انہوں نے اُس عورت کی ساری بات سُن لی تھی۔ عنبر ابھی تک ریسیور تھامے ہوئے تھا۔ اُس نے آہستہ سے رسیور رکھ دیا۔ پھر تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد وہ بولا:

"معلُوم ہوتا ہے سرفراز بیگ کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا ہے۔ اچھا، اب تو ہم نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے ہی لیا ہے۔ جو کچھ ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

اس نے ایک بار پھر رسیور اُٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور کہا "اللہ داد ڈرائیور

کار لے کر فوراً میرے گھر آ جائے۔ جی ہاں۔۔۔۔۔۔۔ میں عنبر بول رہا ہوں۔"

"اللہ داد کو کِس لیے بُلوایا ہے تُم نے؟" عاقِب نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں خود ہی محمّد دین کے چچا خُدا بخش سے ملنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اور کام کی بات بتا دے۔ محمّد دین ابھی راستے میں ہو گا اور ہم اُسے اپنی کار پر جالیں گے۔"

پانچ منٹ بعد وہ تینوں مرسیڈیز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ محمّد دین کی گدھا گاڑی اُنہیں دُور ہی سے نظر آ گئی۔ جب اُنہوں نے گدھا گاڑی کے قریب پہنچ کر کار روکی اور محمّد دین نے اُنہیں دیکھا تو وہ بے حد حیران ہوا۔ اُس نے پچکار کر گدھے کو روکا اور چھلانگ لگا کر گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔

"ارے! آپ یہاں کیسے آ گئے؟" اس نے پُوچھا

"ہمیں اپنے گھر لے چلو محمّد دین۔ ہم تمہارے چچا سے ملنا چاہتے ہیں۔"

عنبر نے کہا۔ ”لیکن محمّد دین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مرسیڈیز کار دیکھ رہا تھا۔

”چلو، گھر چلو۔ وہاں تُم اپنی گاڑی چھوڑ دینا، پھر تمہیں اِس کار میں سیر کرائیں گے۔“ نسیم نے کہا۔

”میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔ آیئے۔“ محمّد دین نے خوش ہو کر کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں چھوٹے چھوٹے کوارٹر نما مکان بنے ہوئے تھے۔ ایک پرانے سے مکان کے آگے انہوں نے کار روکی۔ محمّد دین نے انہیں وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود بجلی کے ایک کھمبے سے گدھا گاڑی باندھ کر مکان کے اندر گھُس گیا۔ عنبر اور اُس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ مکان سے کچھ فاصلے پر سیاہ رنگ کی ایک اور کار بھی کھڑی ہے۔

مکان کے اندر سے کسی شخص کے زور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ عنبر نے نسیم کا ہاتھ پکڑ کر گھسٹتے ہوئے کہا۔ ”جلدی کرو۔۔۔۔۔ میرے ساتھ آؤ۔“ اور اس سے پہلے کہ نسیم کچھ سمجھ سکے، عنبر دروازے پر پڑا

ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ سامنے ہی چھوٹے سے کچّے صحن میں بان کی ٹوٹی پھُوٹی چارپائی پر ایک شخص لیٹا کھانس رہا تھا اور اُس کے قریب کون کھڑا تھا؟ عنبر اور نسیم کو پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی۔ وہ سرفراز بیگ تھا۔ اُس کی پیٹھ لڑکوں کی طرف تھی اور وہ چارپائی پر لیٹے ہوئے بیمار شخص سے کہہ رہا تھا:

"میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔۔ تمھیں یاد کر کے بتانا پڑے گا کہ وہ طوطے تم نے کِن کِن لوگوں کے ہاتھ بیچے تھے۔ مجھے اُن میں سے صرف دو طوطوں کا پتا چلا ہے۔ ایک نوّاب جمشید کے پاس تھا اور دوسرا بیگم مریم کے پاس۔ میں نے وہ دونوں طوطے حاصل کر لیے ہیں۔ ان کے علاوہ مجھے دو طوطوں کا سُراغ بھی مل گیا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ سُرمئی پروں والا افریقی طوطا تُم نے کِس ہاتھ بیچا تھا؟ وہی جس کا نام کالا ڈاکو تھا۔"

"جناب، میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ مجھے بالکل یاد نہیں کہ وہ طوطا میں نے کسے دیا تھا۔" خدا بخش نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔ "میں

نے اپنی زندگی میں ہزاروں طوطے بیچے ہوں گے۔ اب بھلا میں اُن تمام خریداروں کے نام پتے کیوں کر یاد رکھ سکتا ہوں۔"

"کیا بات ہے چاچا جی؟" محمّد دین نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُونچی آواز سے کہا۔ "یہ بابو جی آپ سے کیا کہہ رہے ہیں؟" محمّد دین کی آواز سُن کر وہ کالا بھُجنگ موٹا آدمی طیش کھا کر پلٹا اور دانت پیس کر ایک طمانچہ اُس کے منہ پر مارا۔ بے چارہ محمّد دین لڑھک کر پرے جا گرا۔ عنبر اور نسیم ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

"خبردار! جو بھی آگے بڑھا، اُسے کچّا ہی چبا جاؤں گا۔" سرفراز بیگ نے چلّا کر کہا۔ "تم لوگ جانتے نہیں میں کون ہوں؟ میں وہ شخص ہوں جس کا نام سُن کر بڑے بڑے بدمعاش کانپ اُٹھتے ہیں۔ جو میرے مقابلے میں آیا، اُسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس لیے میں تمھیں آخری بار سمجھاتا ہوں کہ میرے راستے میں نہ آؤ اور میرے کاموں میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کرو۔ میں واقعی بہت بُرا آدمی ہوں۔ ہٹ جاؤ سامنے

سے۔“

چند لمحے بعد وہ اپنی کالے رنگ کی کار میں سوار ہو کر جا چکا تھا۔ نسیم، عنبر اور محمّد دین ہکّا بکّا اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے تھے۔ خدا بخش بے بسی سے چارپائی پر لیٹا کھانس رہا تھا۔ اُس کی حالت بڑی خراب تھی۔

”میرا خیال ہے، ہم اس کا پیچھا کریں اور دیکھیں وہ کہاں جاتا ہے۔“ نسیم نے کہا لیکن عنبر نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”نہیں۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ بہر حال، ہمارے پاس اُس کا نام اور پتا موجود ہے۔ تُم نے دیکھا کہ وہ برابر دھمکیاں دے رہا تھا۔ دھمکیاں وہی شخص دیتا ہے جو اندر سے خوف زدہ اور بد حواس ہو چکا ہو۔ یہ شخص ہم سے خوف زدہ ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خُدا بخش کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ اُس وقت بے چارے خُدا بخش پر کھانسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ محمّد دین نے جھٹ صُراحی میں سے پانی ایک پیالے میں انڈیلا اور اپنے چچا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر

اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی اور اُس نے سوالیہ نگاہوں سے عنبر اور نسیم کی طرف دیکھا۔ محمّد دین نے چند لفظوں میں دونوں لڑکوں کے بارے میں اُسے بتایا۔

عنبر نے کہا۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو خواہ مخواہ اس صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ہم آپ سے پوچھنے آتے ہیں کہ ان طوطوں کا قصّہ کیا ہے؟“

”ارے صاحب، مجھ سے قسم لے لیجیے کہ کچھ معلوم ہو۔ میں ابھی تک سمجھ ہی نہیں پایا کہ یہ بھلا آدمی جو ابھی یہاں سے گیا ہے، اُسے اِن طوطوں سے کیا دل چسپی ہے جو میں نے مختلف گاہکوں کے ہاتھ دس دس بیس بیس یا سو پچاس روپوں میں بیچے ہیں۔ اب وہ مُجھ سے پُوچھ رہا ہے کہ کالا ڈاکو میں نے کِس کے ہاتھ فروخت کیا۔ بہتیرا دماغ پر زور دیتا ہوں، کچھ یاد نہیں آتا۔ اِتنا خیال ہے کہ وہ طوطا شاید میں نے کسی عورت کے ہاتھ پانچ روپے میں بیچا تھا۔ گلی محلّے یا مکان کا مجھے کچھ یاد نہیں۔“

"سوال یہ ہے کہ سر فراز بیگ کو اِن طوطوں کے بارے میں اِتنی پُوچھ گچھ کی آخر کیا ضرورت پڑی ہے؟" نسیم نے کہا۔

"جناب، میں اس بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ اِس کا جواب تو سر فراز بیگ ہی دے سکتا ہے۔" خُدا بخش نے جواب دیا۔

اتنے میں باہر سے کسی عورت کے زور زور سے بولنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ کسی سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا خُدا بخش طوطے والے کا گھر یہی ہے؟"

محمّد دین لپک کر باہر گیا اور چند لمحوں بعد ایک درمیانی عمر کی عورت کے ساتھ اندر آیا۔ عورت کے ہاتھ میں لوہے کے تاروں کا پنجرا تھا اور پنجرے میں سُرمئی پروں والا ایک طوطا۔

عورت نے اندر آتے ہی نسیم اور عنبر کو گھور کر دیکھا اور اُونچی آواز میں بولی "لڑکو! تُم کون ہو؟ اور وہ بدمعاش خُدا بخش کہاں ہے؟"

محمّد دین نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میرا اچچا بیمار ہے۔ کہیے آپ کو اُس سے کیا

کام ہے؟ میں اُس کا بھتیجا محمّد دین ہوں۔"

عورت نے طوطے کا پنجرا زمین پر پٹخ دیا۔ "میرے روپے واپس کرو۔ تمہارے چچانے یہ طوطا میرے ہاتھ پانچ روپے میں بیچا تھا، اور کہا تھا کہ یہ اعلیٰ نسل کا افریقی طوطا ہے، لیکن میر ادا ماد کہتا ہے کہ یہ بالکل بے کار ہے۔ اس کے علاوہ اِس کی آواز بھی بڑی خوف ناک ہے، کوّے کی سی۔ مُجھے نہیں چاہیے یہ طوطا۔"

محمّد دین کا چہرہ لٹک گیا۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس روپے کا وہی نوٹ نکالا جو عنبر نے اُسے دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ اس میں سے اپنے پانچ روپے لے لیجیے اور بقیہ پانچ مجھے لوٹا دیجیے۔ اس نے نوٹ عورت کی طرف بڑھایا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس طوطے کی وجہ سے پریشانی ہوئی۔ میں اپنے بیمار چچا کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔"

عورت نے دس کا نوٹ اپنے پرس میں رکھا، پانچ کا ایک نوٹ نکال کر محمّد

دین کی طرف پھینکا اور بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ محمّد دین نے طوطے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نسیم اور عنبر سے کہا۔ ”غالباً یہ وہ طوطا ہے جس کا نام چچا نے کالا ڈاکو رکھا تھا اور جس کو پانے کے لیے وہ کار والا آدمی بے چین تھا۔“

عنبر اور نسیم نے چونک کر طوطے کو دیکھا۔ طوطا پنجرے میں پھڑ پھڑایا اور پھر کہنے لگا۔ ”میں کالا ڈاکو ہوں۔۔۔۔۔ میں کالا ڈاکو۔۔۔۔ میں کالا ڈاکو ہوں۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔ میں نے اپنا خزانہ۔۔۔ قبرستان میں۔۔۔۔ دبا دیا ہے۔۔۔ ہُو۔۔ ہُو۔۔۔ ہُو۔“

لڑکے حیرت سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

”ہاں، یہی وہ طوطا ہے جس کی تلاش سرفراز بیگ کو ہے۔“ نسیم نے کہا اور پنجرا کھول کر طوطے کر باہر نکالنے لگا۔ طوطے نے اپنی نوکیلی چونچ اُس کی کلائی میں گاڑ دی۔ نسیم نے چیخ ماری اور طوطے کو چھوڑ دیا۔ طوطے نے پر پھیلائے اور اُڑ کر غائب ہو گیا۔

کالا ڈاکو

"نسیم! تم نے یہ کیا غضب کیا۔" عنبر چلّایا۔ "اتنا قیمتی طوطا ہاتھ سے گنوا دیا۔ بھلا اُسے پنجرے سے نکالنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اجی لعنت بھیجو۔" نسیم نے جھلّا کر کہا۔ "کم بخت میری بوٹی ہی اُڑا کر لے گیا۔ یہ دیکھو؟"

اُس نے عنبر اور محمّد دین کو اپنی کلائی دکھائی۔ واقعی کالے ڈاکو نے اپنی ایسی چونچ ماری تھی کہ نسیم کی کلائی سے خون نکل آیا تھا۔ اُس نے جلدی سے

رومال پانی میں بھگو کر کلائی پر باندھا تب کہیں خون رُکا۔

خُدا بخش چارپائی پر چُپ چاپ لیٹا تھا۔ اچانک اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”مجھے افسوس ہے جناب آپ کو خواہ مخواہ پریشانی ہوئی۔ آپ شاید کچھ پوچھنے کے لیے آئے تھے۔ فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”میاں خدا بخش، ہمیں خود رنج ہے کہ اس حالت میں آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔“ عنبر نے کہا۔ ”لیکن مجبوری ہی کچھ ایسی آن پڑی ہے۔ اِن طوطوں کے پیچھے ایک چالاک اور مکّار مُجرم لگا ہوا ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آخر اُسے اِن طوطوں سے کیا دل چسپی ہے۔“

خُدا بخش نے گہرا سانس لے کر دو تین مرتبہ گردن ہلائی اور بولا۔ ”صاحب، کیا بتاؤں آپ کو۔ خود میری عقل بھی کام نہیں کرتی۔ خیر، جو کُچھ مُجھے معلوم ہے، وہ عرض کیے دیتا ہوں۔ کچھ مدّت پہلے کا ذکر ہے، ایک لمبا دُبلا پتلا شخص میرے گھر آیا۔ اس کا نام علی جان تھا اور وہ ایران

سے آیا تھا۔ میں اُسے بالکل نہیں جانتا تھا، لیکن اُسے شریف اور اچھا آدمی سمجھ کر میں نے کہا کہ تم جب تک چاہو مکان میں رہ سکتے ہو۔ علی جان کچھ بیمار تھا۔ اُسی نے بعد میں بتایا کہ وہ بڑی مُشکل سے ایران سے پاکستان کی سرحد عبور کر کے آیا ہے۔ ایک تھیلے میں چند بوسیدہ اور میلے کپڑے اُس کے پاس تھے اور ٹین کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا بکس۔ اُس بکس کی لمبائی کوئی دو فٹ اور چوڑائی چودہ انچ ہو گی، اور اس میں لوہے کا بڑا مضبوط تالا لگا تھا۔ علی جان ہر وقت اُس بکس کو اپنے ساتھ رکھتا، حتّٰی کہ رات کو سوتے وقت بھی یہ بکس اُس کے سر کے نیچے رکھا رہتا۔ کبھی کبھار وہ علیحدگی میں اُسے کھول کر دیکھتا اور آپ ہی آپ خوش ہوتا۔ پھر جلدی سے بند کر کے تالا ڈال دیتا۔ میں نے اُس سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ اِس بکس میں کیا ہے۔ یہ بات ویسے بھی ٹھیک نہ تھی کہ میں اپنے مہمان سے ایسی باتیں پوچھوں جن کا جواب دینا وہ پسند نہ کرتا۔ اگر اُسے بتانا ہوتا تو وہ خود ہی بتا دیتا۔ خیر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس میں ضرور کوئی قیمتی چیز ہے۔"

خُدا بخش نے چند لمحے چُپ رہنے کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "کئی دِن گُزر گئے آخر علی جان نے خود ہی بتایا کہ برادر خُدا بخش، جانتے ہو اِس صندوق میں کیا ہے؟ میں نے انکار میں گردن ہلائی۔ تب وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ اِس میں بہت بڑی دولت بند ہے۔ تُم نے بارش کے بعد آسمان پر رنگ برنگ دھنک نکلتے دیکھی ہو گی۔ یہ سمجھو کہ اِس بکس میں اُسی دھنک کا ایک ٹکڑا بند ہے اور اس ٹکڑے کے نیچے سونا ہی سونا ہے۔

علی جان کی یہ باتیں سُن کر مجھے شک ہونے لگا کہ بیماری کے باعث اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ وہ گھنٹوں ایک جگہ بیٹھا کچھ سوچتا رہتا تھا اور آپ ہی آپ فارسی زبان میں باتیں کرتا جو میری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ خُدا بخش، میری ایک بات مانو گے؟ میں نے کہا کہ ضرور مانوں گا۔ اُس نے کہا مجھے اپنے طوطوں میں سے سات طوطے دے دو۔ میں اس عجیب فرمائش پر حیران رہ گیا۔ میں نے کہا کہ بڑے شوق سے لے لو۔ لیکن تُم اِن طوطوں کا کرو گے کیا۔ اس نے جواب

دیا کہ میں انہیں بولنا سکھاؤں گا۔ شاید اِسی طرح میرا دل بہل جائے۔ اُس نے سات طوطے چُن لیے اور حیرت کی بات ہے کہ اُن سب طوطوں کے سر زرد رنگ کے تھے۔ اُس نے طوطوں کو الگ الگ پنجرے میں بند کیا اور انہیں بولنا سکھایا۔ یوں تو وہ ہر طوطے پر پوری توجّہ دیتا لیکن اُسے سنہری پروں والے اُس افریقی نسل کے طوطے سے خاص دل چسپی تھی اور یہ طوطا بھی اُس سے بہت ہل گیا تھا۔ کبھی کبھی علی جان اُسے پنجرے سے نکال کر اپنے کندھے پر بٹھالیتا اور نہ جانے چُپکے چُپکے کیا باتیں کرتا۔ علی جان نے ہی اصل میں اِن طوطوں کے عجیب و غریب نام رکھے تھے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اُن میں سے ایک طوطا مر گیا۔ اُس طوطے کے مرنے سے علی جان کو بے حد رنج پہنچ اور وہ بڑبڑا کر کہنے لگا کہ کوئی بات نہیں۔ یہ کالاڈاکو مرنے والے طوطے کی جگہ کام کرے گا۔ اُس کے کہنے کا مطلب کیا تھا؟ میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ میں نے اندازہ کیا کہ بے چارے علی جان کا دماغ چل گیا ہے جو وہ اس قسم کی بے معنی باتیں کرتا رہتا ہے۔

مرنے والے طوطے کی جگہ اُس نے زرد سر والا ایک اور طوطا مجھ سے لے لیا۔ اِس تمام عرصے میں ٹین کا وہ بکس ہمیشہ اُس کے ساتھ رہا اور ایک دفعہ بھی اُس نے ہمیں اُس کے اندر دیکھنے کا موقع نہ دیا۔ غرض اِسی طرح دِن گزرتے رہے۔ ایک رات وہ اپنا بکس لے کر گھر سے گیا اور واپس نہ آیا۔ ایک دن گزرا، دو دن گزرے، تین دن گزرے۔ اُس کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں پریشان ہوا کہ خُدا جانے علی جان پر کیا بیتی چوتھے دن وہ خود ہی گرتا پڑتا آگیا، لیکن اُس کے ساتھ وہ بکس نہ تھا۔ میں نے پوچھا کہ تم کہاں چلے گئے تھے اور بکس کہاں گیا؟ علی جان نے صرف اِتنا بتایا کہ وہ بکس اُس نے ایک جگہ چھپا دیا ہے، کیوں کہ اُس کا اپنے پاس زیادہ دیر تک رکھنا ٹھیک نہ تھا۔ اُس کی حالت بہت خراب تھی۔ بدن سُوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اُس کا آخری وقت آگیا ہے۔ میں نے بھی زیادہ کُریدنے کی کوشش نہ کی۔ اگلے دِن اُس نے کہیں سے ایک کاغذ اور پنسل حاصل کی اور لمبا چوڑا خط لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ

اِسے لیٹر بکس ڈال آؤ۔ ٹکٹ لگا لفافہ اُس کے پاس پہلے ہی موجود تھا۔ وہ دیر تک خط لکھتا اور بار بار اُسے پڑھتا رہا۔ آخر خط اس نے خود لفافے میں بند کر کے مجھے دیا۔"

"اس پر پتا کس کا تھا؟" عنبر نے پوچھا۔

خدا بخش نے انکار میں گردن ہلائی۔ "آپ جانتے ہیں کہ میں پڑھا لکھا نہیں۔ علی جان کی حالت اُس کے بعد اور بگڑ گئی۔ میں نے اُسے ہسپتال لے جانا چاہا، مگر اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ دنیا کا کوئی ڈاکٹر میری بیماری کا علاج نہیں کر سکتا۔ میں اب میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور اپنے دوستوں کے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا۔"

خُدا بخش ایک لمحے کے لیے چُپ ہوا اور پھر بولا۔ "جناب، وہ بڑا انرالا آدمی تھا۔ بعض وقت میری سمجھ میں اُس کی باتیں نہیں آتی تھیں۔ ایک دن وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مکان سے باہر لے گیا اور آہستہ سے کہنے لگا کہ دیکھو خُدا بخش، میرے جانے کے بعد ایک موٹا سا آدمی تمہارے پاس آئے گا۔ وہ

تمہیں ایک ہزار روپے دے گا اور تم اُسے یہ تمام طوطے دے دینا جنہیں میں نے بولنا سکھایا ہے۔ سمجھ گئے نا؟ میں نے کہا، خوب سمجھ گیا، یہ سُن کر علی جان نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔ جب تُم اُس موٹے آدمی کو یہ طوطے دو گے تو مزا آجائے گا۔ اگر اُسے پسینہ نہ آجائے تو میرا نام علی جان نہیں۔

غرض وہ اسی طرح قہقہے لگاتا رہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ پاگل ہو چکا ہے۔ اُس رات وہ جلد ہی اپنے بستر پر لیٹ کر سو گیا، لیکن صُبح جب میں نے اُسے جگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ تو مر چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں غریب آدمی ہوں۔ میں نے بڑی مُشکل سے کُچھ قرض لیا اور علی جان کو دفنا دیا۔ اُس کے کفن دفن پر کوئی دو سو روپے اُٹھ گئے۔ لیکن مجھے یہ امّید بھی تھی کہ جس موٹے آدمی کا ذکر وہ کرتا تھا، شاید وہ آہی جائے اور طوطوں کے بدلے میں مجھے ایک ہزار روپے ملیں تو میں اُس رقم میں سے قرض کا دو سو روپیہ بھی ادا کر دوں گا۔ لیکن دِن پر دِن گُزرتے گئے اور وہ موٹا نہ آیا۔ جن لوگوں سے میں نے روپے قرض لیے تھے، وہ رقم کا تقاضا

کرنے لگے مجبور ہو کر میں نے وہ زرد سروں والے طوطے بھی بیچ ڈالے اور اس طرح کچھ قرض ادا کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ دو ہفتے بعد ایک دن اچانک وہ موٹا آدمی آ گیا اور جب میں نے اُسے بتایا کہ میں تمام طوطے بیچ چُکا ہوں تو وہ سخت ناراض ہوا اور پوچھنے لگا کہ اُن سب لوگوں کے نام پتے بتاؤ جنھوں نے وہ طوطے خریدے ہیں۔ جو جو مُجھے یاد آئے، میں نے اُسے بتا دیے اور وہ چلا گیا۔ اُس کے پاس سُرخ رنگ کی بہت قیمتی کار بھی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ واقعی مال دار آدمی ہے۔"

"جاتے ہوئے وہ تمھیں ایک کارڈ بھی دے گیا تھا جس پر شاید اُس کا نام اور پتا لکھا ہو گا؟" عنبر نے پوچھا۔

"ہاں جی دے تو گیا تھا اور میں نے وہاں طاق میں رکھ دیا تھا۔" خُدا بخش نے جواب دیا۔ "محمّد دین، ذرا دیکھنا تو کارڈ وہی کہیں ہو گا۔"

محمّد دین نے طاق میں دیکھا اور مایوسی سے گردن ہلائی۔ "چچا، یہاں تو نہیں ہے۔ شاید ہوا سے اُڑ گیا اور جب میں نے صحن اور کمرے کی صفائی کے لیے

جھاڑو دی ہو گی تو وہ کوڑے کے ساتھ ہی چلا گیا ہو گا۔"

"خیر، چھوڑو اسے۔" عنبر نے کہا۔ "ہمیں اب اُس کارڈ کی زیادہ ضرورت بھی نہیں ہے۔ اچھّا، محمّد دین، ہم چلتے ہیں۔ تُم نے ہمیں اتنی باتیں بتائیں، اُس کا بہت بہت شکریہ۔ اور ہاں، چچا خُدا بخش، اگر وہ موٹا آدمی پھر تمہارے پاس آئے تو ہمیں ضرور اِطّلاع کر دینا۔ خدا حافظ۔"

اس واقعے کو کئی دن گُزر گئے۔ تینوں لڑکے روزانہ مرسیڈیز گاڑی میں، اللہ داد ڈرائیور کے ساتھ شہر کے مختلف حصّوں میں گھومتے کہ شاید کہیں سرفراز بیگ کی سُرخ اسپورٹس ماڈل کار نظر آ جائے، لیکن وہ پھر دکھائی نہ دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرفراز بیگ اس شہر سے کہیں اور چلا گیا ہے۔

ایک روز دوپہر کے بعد جب عنبر، نسیم اور عاقِب اپنے ہیڈ کوارٹر میں واپس پہنچے تو عنبر کی خالہ نے کہا۔ "ابھی ابھی ایک لڑکا گدھا گاڑی پر کالے پروں والا ایک طوطا لے کر آیا تھا۔ اُس نے کہا کہ طوطا لے لیجیے۔ اس کے ساتھ ایک پرچہ بھی تھا۔ میں نے وہ پنجرا تمہارے کمرے میں رکھوا دیا ہے۔

کاغذ کا وہ پُرزہ بھی وہیں میز پر ہو گا۔"

"محمّد دین آیا ہو گا۔" عنبر نے جلدی سے کہا۔ وہ تینوں کمرے کے اندر گئے۔ سامنے ہی پنجرے میں بند کالا ڈاکو نظر آیا۔ یہی وہ طوطا تھا۔ جس نے نسیم کی کلائی چونچ مار کر زخمی کر دی تھی۔ میز پر مُڑا تُڑا ایک کاغذ پڑا تھا۔ عنبر نے کاغذ اُٹھایا۔ اس پر پنسل سے لکھا تھا:

"بھائی جان، کل شام کالا ڈاکو آپ ہی آپ واپس آ گیا۔ میں یہ سوچ کر کہ شاید اس طوطے کے ذریعے آپ کو کچھ باتیں معلوم ہوں، اِسے پنجرے میں بند کر کے چھوڑے جا رہا ہوں۔ وہ موٹا بھی اِسی کی تلاش میں ہے۔ لیکن چچا خُدا بخش نے مُجھے ہدایت کی ہے کہ یہ طوطا میں آپ کو اُن کی طرف سے تحفے میں پیش کروں۔

فقط آپ کا بھائی، محمّد دین۔"

"میں کالا ڈاکو ہوں ـــــ میں کالا ڈاکو ہوں ـــــ ہاہا میں نے ـــــ اپنا ـــ خزانہ ـــ قبرستان میں دبا دیا ـــ ہے ـــ ہُو ہُو

ہُو۔۔۔میں کالا ڈاکو ہوں۔" طوطا پھڑ پھڑا کر بُری طرح چلّا رہا تھا۔

"چُپ، کالے ڈاکو کے بچّے۔" نسیم نے طوطے کو ڈانٹا۔ "اگر اب بولا تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"پولیس۔۔۔۔پولیس۔۔۔۔پولیس۔۔۔" طوطا پھر چلّایا۔

تینوں لڑکے حیرت سے طوطے کو تکنے لگے۔

"بھئی، یہ تو خوب ہوتا ہے۔" عاقِب نے کہا۔ "اتنی صاف زبان کہ کوئی دور سے سُنے تو دھوکا کھا جائے کہ یہ آدمی بول رہا ہے یا طوطا۔"

اتنے میں باہر کے دروازے کی گھنٹی زور سے بجی۔ عنبر باہر گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھا۔

"ڈاکیا تھا۔ یہ خط لیٹر بکس میں ڈال گیا ہے۔"

"خط؟ کس کا خط؟" نسیم نے پوچھا۔

"ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" عنبر نے لفافہ چاک کیا تو اُس کے اندر سے

کوئی تین اِنچ لمبا اور دو انچ چوڑا ایک خُوب صُورت کارڈ نکلا۔ اس پر چمک دار موٹے حروف میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

سر فراز بیگ

میں قیمتی اور نادر چیزیں خرید تا ہوں۔ اگر آپ کے پاس ایسی کوئی چیز ہے تو فوراً مجھ سے اچھّی قیمت حاصل کیجیے۔

ٹیلیفون نمبر ۴۱۳۳۶۵

لفافے پر ٹائپ رائٹر سے عنبر کا نام اور اُس کے گھر کا پتا ٹائپ کیا گیا تھا۔ لڑکوں نے باری باری یہ کارڈ اور لفافہ دیکھا۔

"شکر ہے۔ ہم مارے مارے پھرنے سے بچ گئے۔" نسیم نے کہا۔

"لیکن اب کیا کیا جائے؟" عاقِب نے کہا۔ "کالا ڈاکو اس وقت ہمارے قبضے میں ہے اور سر فراز بیگ کو اس کی تلاش ہے۔ کیوں نہ ہم اُسے فون کر کے اِطّلاع دیں کہ وہ طوطا ہمارے پاس ہے، خریدنا ہے تو خرید لو۔ ایک ہزار

روپیہ قیمت ہو گی۔"

"بھئی واہ! کیا بات کہی ہے تم نے۔" نسیم نے خوش ہو کر عاقِب کی پیٹھ تھپکی۔ "بہت دور کی کوڑی لانے لگے ہو اب تم۔"

"بات تو کچھ مناسب ہی ہے۔" عنبر نے نِچلا ہونٹ ناخن سے نوچتے ہوئے کہا۔ "عاقِب، تم ہی اس نمبر پر فون کرو۔ سر فراز بیگ نے تُمہاری آواز پہلے نہیں سُنی ہے۔ تُم اس سے کہنا کہ جناب، مُجھے آپ کے بارے میں کسی نے بتایا ہے کہ آپ نادر اور قیمتی چیزیں خریدنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ میرے پاس سُنہری پروں اور زرد رنگ نے سر والا ایک اعلیٰ نسل کا طوطا ہے۔ کیا آپ اِسے خریدیں گے؟ اگر وہ کہے کہ ہاں، میں خریدوں گا تب تم اُس سے پتا معلُوم کرنا۔"

عاقِب نے ٹیلی فون کا رسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔ عنبر نے لاؤڈ اسپیکر کا بٹن دبا دیا تاکہ سر فراز بیگ جو کہے وہ نسیم اور عنبر آسانی سے سُن سکیں۔ چند لمحے گھنٹی بجتی رہی۔ پھر دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ "جی، فرمائیے؟

کون صاحب ہیں؟"

"کیا یہ ۴۱۳۳۶۵ ہے؟" عاقِب نے پُوچھا۔

"جی جناب۔۔۔۔۔یہی نمبر ہے۔"

"مہربانی کر کے سرفراز بیگ صاحب سے ملوا دیجیے۔ ایک ضروری بات اُن سے کہنی ہے۔" عاقِب نے کہا۔

"سرفراز بیگ؟ وہ تو کئی دن ہوئے یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

"کہاں چلے گئے؟" عاقِب نے پُوچھا۔

"انہوں نے بلڈنگ میں دو کمرے کُچھ عرصہ پہلے کرائے پر لیے تھے۔ میں اس بلڈنگ کا مالک بول رہا ہوں۔ جاتے وقت وہ اپنا پتا نشان بتا کر نہیں گئے۔"

عاقِب نے شکریہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ نسیم اور عنبر نے یہ تمام باتیں لاؤڈ اسپیکر پر سُن لی تھیں اور اب اُن دونوں کے چہرے لٹک گئے تھے۔

”لیجیے جناب، پنچھی اُڑ گیا اور ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔“ نسیم نے کہا ”لیکن سوال یہ ہے کہ جو چار طوطے اُس نے چُرائے تھے یا حاصل کیے تھے، وہ کہاں رکھّے ہوں گے؟“

”کہیں بھی رکھّے ہوں گے۔“ عنبر نے کہا۔ ”ایسے مجرموں کے کئی ٹھکانے ہوتے ہیں۔“

”بہر حال، ہم جہاں سے چلے تھے، وہیں گھوم پھر کر آ گئے۔“ نسیم نے کہا۔ ”یہ اچھّی سُراغ رسانی ہے۔ کچھ بھی پلّے نہیں پڑا۔“

”نہیں، ہمیں بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔“ عاقِب نے کہا۔ ”ہمیں علی جان کا پتا ملا جو اس سارے جھگڑے کی بُنیاد ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تھا کون؟ کہاں سے آیا؟ اُس کے پاس ٹین کا جو بکس تھا، اُس میں کیا چیز بند تھی؟ سونا؟ ہیرے جواہر یا کوئی اور ایسی ہی قیمتی چیز؟ پہلے سروں والے سات طوطے پالنے سے اُس کا مقصد کیا تھا؟ پھر مرنے سے پہلے اُس نے خُدا بخش کو ایک خط بھی ڈاک میں ڈالنے کے لیے دیا تھا۔ یہ خط کِس کے نام

تھا اور اُس میں علی جان نے کیا لکھا تھا؟ پھر اُس کا یہ کہنا کہ کچھ عرصے بعد ایک موٹا آدمی خُدا بخش کے پاس طوطے لینے آئے گا اور اُسے ایک ہزار روپے تک کی رقم دے گا۔۔۔۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔۔۔۔ سر فراز بیگ طوطے لینے کے لیے خُدا بخش کے گھر آیا۔ لیکن اُس نے آنے میں دیر لگائی؟ سوال یہ ہے کہ وہ وقت پر کیوں نہ آیا؟ اس دوران میں خُدا بخش اپنا قرض اُتارنے کے لیے وہ ساتوں طوطے بیچ چکا تھا۔ پھر یہ جاننا بھی ہمارے لیے ضروری ہے کہ اِن طوطوں میں ایسی کیا بات تھی کہ سر فراز بیگ اُن کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے؟ چار طوطے وہ حاصل کر چُکا ہے۔ پانچواں ہمارے پاس ہے۔ باقی رہے دو طوطے، ہم بھی اُنہیں ڈھونڈیں۔ پھر سر فراز بیگ کو ہمارے پاس آنا پڑے گا۔ ہمیں اُسے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔"

"بہت خوب!" نسیم نے تالی بجا کر کہا۔ "تمہیں تو واقعی خُفیہ پولیس میں بھرتی ہو جانا چاہیے۔"

”اب کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ دو طوطے ہمیں کہیں سے مل جائیں۔ پھر معاملہ آگے بڑھے گا۔ ورنہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔“عنبر نے کہا۔

”کیوں نہ اخبار میں اشتہار دیں کہ ہمیں دو بولنے والے سُنہری طوطوں کی ضرورت ہے جن کے سر زرد ہوں۔“نسیم نے کہا۔

”ہاں، ترکیب تو اچھّی ہے لیکن اخبار میں اشتہار کے لیے رقم درکار ہے۔ یہ رقم کہاں سے آئے گی؟“ عاقِب نے پوچھا۔

”ہم چندہ کیوں نہ کر لیں؟“ نسیم نے کہا۔ ”میں اپنے جیب خرچ میں سے دس روپے دے سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ دس روپے میں دوں گا۔“ عاقِب نے کہا۔

عنبر نے بھی اقرار میں گردنِ ہلائی۔ پھر اُنہوں نے اخبار میں اشتہار دینے کے لیے مضمون بنایا اور اُس کے بعد اخبار کے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔

اشتہار کے جواب میں یوں تو بہت سے لوگوں کے خط آئے جن میں اُنہوں نے طوطے بیچنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، لیکن ان میں دو خط ایسے تھے جن پر ننّھے سُراغ رسانوں نے خاص طور پر توجّہ دی۔ ان خطوں میں کہا گیا تھا کہ اُن کے پاس ایسے سُنہری طوطے میں جن کے سر زرد رنگ کے ہیں اور وہ عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔

عنبر نے کار منگوانے کے لیے ٹیلے فون کیا، کمپنی والوں نے بتایا کہ مرسیڈیز کار روانہ کی جارہی ہے، لیکن اللہ داد ڈرائیور نہیں آسکے گا۔ کیوں کہ وہ اِن دِنوں چھٹی پر چلا گیا ہے۔ اُس کی جگہ دوسرا ڈرائیور صادق مرزا آرہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد صادق مرزا کار لے کر آگیا۔ اُس نے عنبر اور نسیم کو ادب سے سلام کیا اور کہنے لگا:

”آیئے جناب، کار میں تشریف رکھیے اور حکم دیجیے کہ کِدھر چلوں؟“

عنبر نے اُسے غور سے دیکھا، وہ چھوٹے قد کا دُبلا پتلا آدمی تھا اور اُس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہر چیز کا غور سے جائزہ لینے کا عادی ہے۔

کار میں بیٹھتے ہی عاقِب نے نئے شہر کا نقشہ نکال کر اپنے سامنے پھیلا لیا اور ڈرائیور سے کہا۔ ”پہلے نئی سڑک کی طرف چلو۔ اس کے آخر میں ایک چوک ہے۔ وہاں سے دائیں ہاتھ ایک پتلی سی سڑک جاتی ہے۔ اُس کے آخر میں پہنچ کر رُک جانا ہے۔“

”بہت بہتر جناب۔“ صادق مرزا نے کہا اور کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ نئی سڑک وہاں سے کوئی پانچ میل دُور تھی۔ انہیں وہاں تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔ دوسری سڑک کے آخر میں جا کر ڈرائیور نے کار روک دی اور گردن پھیر کر سوالیہ نظروں سے نسیم کی طرف دیکھنے لگا۔ عنبر اُن کے ساتھ نہیں آ سکا تھا۔ اُس کی خالہ کی طبعیت اچانک خراب ہو گئی تھی اور اُن کی تیمار داری کے لیے اُسے گھر ہی میں رُکنا پڑا تھا۔ اُس نے نسیم اور عاقِب کو صادق مرزا ڈرائیور کے ساتھ جانے کی ہدایت کی تھی۔

”تم یہیں ٹھہرو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“ نسیم اور عاقِب نے کار سے اُتر کر کہا۔ وہاں سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر ایک پرانی بوسیدہ سی عمارت

تھی۔

”میرا خیال ہے، یہی پتا اِس خط میں لکھا ہے۔“ عاقِب سے ایک کاغذ نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ دیکھیں۔“

اُنھوں نے دروازے پر جا کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے لمبے قد کا سوکھا سا لڑکا باہر آیا۔ اُس کے چہرے پر شرارت بھری مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”جاوید اختر؟“ نسیم اور عاقِب نے حیرت سے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں یہیں رہتا ہوں۔“ جاوید اختر نے دانت نکال دیے۔ وہ عنبر کا ہم جماعت تھا اور اُسے عنبر کی ذہانت اور قابلیت سے خُدا واسطے کا بیر تھا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے اُس کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا تھا لیکن ابھی تک اُس کی کوئی حرکت کامیاب نہ ہوئی تھی اور وہ برابر منہ کی کھاتا تھا۔ نسیم اور عاقِب کو بھی اُس کے بارے میں سب کچھ معلُوم تھا۔

جاوید کے دونوں ہاتھ پیٹھ کی طرف تھے، جیسے وہ کوئی چیز نسیم اور عاقِب سے چھُپانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم لوگ دیر سے آئے۔" اُس نے ہنس کر کہا۔

"کیا مطلب؟" نسیم نے پوچھا۔ "تُم نے فرضی نام سے ہمیں بُلایا ہے اور ہم ٹھیک وقت پر پہنچے ہیں۔"

جاوید اختر نے پھر قہقہہ لگایا اور دونوں ہاتھ ایک دم اُن کے سامنے کر دیے۔ عاقِب اور نسیم نے دیکھا کہ لوہے کے چھوٹے سے پنجرے میں زرد سر والا ایک سُنہری طوطا بند ہے۔ طوطے کی دائیں آنکھ غائب ہے۔ شاید کسی دوسرے طوطے سے جنگ میں یہ آنکھ نِکل گئی ہو گی۔

"میں یہ طوطا تمہارے ہاتھ بیچ دیتا، لیکن اب نہیں بیچوں گا۔ کیوں کہ مجھے ایک اور شخص نے اِس کے ڈیڑھ سو روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اتّفاق سے پرسوں صُبح ہی میں نے یہ طوطا خریدا۔ اِس سے پہلے میں اخبار میں اِس کے بارے میں اشتہار دیکھ چکا تھا۔ اچھّا دوستو، خُدا حافظ۔"

وہ ہنستا ہوا پیچھے مُڑا تو پنجرے میں قید طوطا زور سے چلّایا۔ ”اُلّو کا پٹھّا۔۔۔۔۔اُلّو کا پٹھّا۔۔۔۔۔۔اُلّو کا پٹھّا۔۔۔۔۔۔“

”چُپ کم بخت! مجھے گالی دیتا ہے۔“ جاوید نے آنکھیں نکال کر طوطے کو ڈانٹا۔ ”ابھی گردن مروڑ دوں گا۔“

”طوطا سچ ہی کہتا ہے۔“ اس مرتبہ نسیم اور عاقِب نے قہقہہ لگایا۔ جاوید نے شرمندہ ہو کر اُن کی طرف دیکھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ طوطا برابر اُسے اُلّو کا پٹھّا کہے جا رہا تھا۔ اُن دونوں کی نگاہوں نے جاوید کا پیچھا کیا۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے کھڑی ہوئی نیلے رنگ کی ایک کار میں بیٹھ گیا۔ کار چل پڑی اور چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پھنس گئے

نسیم اور عاقِب حیرت سے اُس نیلی کار کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے غائب ہو گئی تو عاقِب نے کہا۔ ”کیا خیال ہے؟ یہ جاوید اختر اس طوطے کو کِس کے ہاتھ بیچنے گیا ہے؟“

”شاید سر فراز بیگ کے ہاتھ۔“ نسیم نے جواب دیا۔ عاقِب نے گردن ہلائی اور بولا۔ ”ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔ اب بولو، کیا ارادے ہیں؟“

”آؤ، دوسرے پتے پر چلیں۔ اُس شخص سے بھی مل کر دیکھ لیتے ہیں کہ وہ

کیا کہتا ہے۔ ایک طوطا فروخت کے لیے اُس کے پاس بھی موجود ہے۔"

نسیم اور عاقِب اپنی کار کی طرف آئے۔ ڈرائیور صادق مرزا اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ انہیں دوسرے پتے پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہاں زرد رنگ کے سر والا ایک سُنہری طوطا فروخت کے لیے دستیاب تھا۔ ایک چھوٹے سے قد کے گنجے آدمی نے نسیم اور عاقِب کو بتایا کہ یہ طوطا اُس نے ایک پھیری والے سے خریدا تھا، کوئی تین ہفتے پہلے۔ طوطے والے نے اُس کا نام بہرام بتایا تھا۔

"بہرام! یہ تو ایک ڈاکو کا نام تھا۔" نسیم نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، برخوردار۔ اسی لیے میری بیوی نے اس طوطے کو گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔" اس آدمی نے افسوس سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بیوی بڑی سمجھ دار معلوم ہوتی ہیں۔" نسیم نے ہنس کر کہا۔ "خیر، لائیے ہم اِس ڈاکو کو لیے جاتے ہیں۔ آپ اس کے کیا دام لیں گئے؟"

”بھئی، میں نے اِس کی قیمت دس روپے ادا کی تھی وہی آپ لوگ دے دیجیے۔“

نسیم نے جلدی سے دس روپے کا نوٹ نکال کر آدمی کو دیا اور طوطے کا پنجرا اُٹھا کر چلنے کو تیّار ہو گا۔ اس آدمی نے جھٹ کہا ”ارے میاں، یہ تو تُم نے طوطے کے پیسے دیے ہیں، پنجرے کی قیمت پانچ روپے بھی تو دو نا؟“

”سبحان اللہ۔“ نسیم نے کہا۔ ”صاحب، ہمیں صرف طوطا چاہیے، پنجرا نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو پنجرا واپس لے سکتے ہیں۔“

”اچھا صاحب اچھا، آپ تو بُرا مان گئے۔ میں نے یہ پنجرا بھی آپ کو دیا۔ شوق سے لے جایئے۔“

وہ دونوں خوشی خوشی طوطے کا پنجرا اُٹھائے واپس چلے۔ بہرام ڈاکو، گردن میں سر دیے، چُپ چاپ بیٹھا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ نسیم اور عاقِب نے بھی اُسے چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔

”میرا خیال ہے اب سیدھے ہیڈ کوارٹر چلیں۔“ عاقِب نے کہا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ نسیم نے جواب دیا۔ پھر اُس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ”کار کہاں غائب ہو گئی؟“

جس جگہ وہ کار چھوڑ کر گئے تھے، وہاں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ دُور دُور تک اُن کی مرسیڈیز اور ڈرائیور صادق مرزا کا کہیں پتا نشان نہ تھا۔

”عجیب آدمی ہے یہ بھی۔ کار لے کے بھاگ گیا۔“ نسیم نے ناراض ہو کر کہا۔ ”مجھے اس قسم کا بے ہودہ مذاق پسند نہیں۔“

اِتنے میں ایک وین اُن کے قریب آن کر رُکی۔ ایک عورت اُسے چلا رہی تھی۔ عاقِب اور نسیم نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”لڑکو! کہاں جانا ہے؟ آؤ، جہاں کہو گے اُتار دُوں گی۔“

لڑکوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال جواب کیے پھر وین کا دروازہ کھول کر دونوں اندر گھُس گئے۔ اُن کے اندر جاتے ہی وین کا دروازہ زور

سے بند ہوا اور پھر کسی نے بھیانک آواز میں قہقہہ لگایا۔ نسیم اور عاقِب نے دیکھا کہ سامنے کالے رنگ کا ایک موٹا تازہ آدمی بیٹھا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں لمبا سا چھُرا تھا۔

"س۔۔۔۔۔ سر۔۔۔۔۔ فراز بیگ۔" نسیم نے خوف سے ہکلا کر کہا۔ عاقِب بھی گُم صُم تھا اور اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

موٹے آدمی نے پھر قہقہہ لگایا اور چھُرا اُوپر اُٹھاتے ہوئے گرج دار آواز میں بولا۔ "آؤ ننّھے چوہو، تشریف لے آؤ۔ میں بہت دیر سے تمہاری تاک میں تھا۔"

یہ کہہ کر اُس نے طوطے کا پنجرا نسیم کے ہاتھ سے چھین کر اپنے پاس رکھ لیا۔ "سچ ہے، سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلا کرتا۔" اُس نے پھر چھُرا اُٹھایا اور ڈپٹ کر بولا۔ "تم دونوں اُس سامنے والی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ خبر دار! کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو گردن کاٹ کر پھینک دُوں گا۔ سمجھے؟"

"سمجھ گئے جناب۔۔۔۔ خوب سمجھ گئے۔" نسیم نے ہولے سے کہا۔

اس کے بعد کوئی نہ بولا۔ وین تیز رفتاری سے سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ پھر وہ شہر سے نکل کر پہاڑی علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں اُونچے نیچے پہاڑی ٹیلے کوسوں میلوں میں پھیلے تھے۔ عورت نے گاڑی چلاتے چلاتے گردن موڑ کر وین کے اندر جھانکا۔ نسیم اور عاقِب کو دیکھ کر مُسکرائی اور کہنے لگی:

"لڑکو! میں نے تمھیں ایک مرتبہ ٹیلے فون پر منع بھی کیا تھا، لیکن تُم نہ مانے۔ اب اس مُصیبت کو بھگتو۔"

عاقِب نے فوراً اس کی آواز پہچان لی۔ بے شک اُسی عورت نے اُسے اور عنبر کو ایک مرتبہ ٹیلے فون پر دھمکی دی تھی کہ وہ سرفراز بیگ کے راستے میں آنے کی کوشش کریں گے تو بُرا نتیجہ نکلے گا۔ یکایک نسیم نے جُرأت کی اور سرفراز بیگ سے کہا:

"آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں اور ہمارے ڈرائیور کو آپ نے کس طرح وہاں سے رفوچکّر کیا؟"

"اچھّا سوال کیا تم نے۔" سرفراز بیگ نے نسیم کو غور دیکھتے ہوئے کہا۔

”اتّفاق ایسا ہوا کہ آج صُبح میں کرائے پر یہ وین لینے جب کمپنی گیا تو مُجھے اُس مرسیڈیز کار کا عِلم ہوا جو تُمھارے سُراغ رساں نمبر ایک کو کسی ذہنی مُقابلے میں اوّل آنے پر کچھ عرصے کے لیے ڈرائیور سمیت استعمال کرنے کو دی گئی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ آج وہ گاڑی ایک نیا ڈرائیور لے کر تُم لوگوں کے گھر جا رہا ہے۔ میں نے اپنی یہ کرایے کی وین اُس مرسیڈیز کار کے پیچھے لگا دی۔ جب تم یہ طوطا لینے گئے ہوئے تھے تو میں نے پبلک ٹیلے فون بوتھ سے کار کے اندر لگے ہوئے فون نمبر کی گھنٹی بجائی۔ مُجھے معلوم تھا کہ کار میں فون بھی لگا ہوا ہے۔ ڈرائیور نے فون سُنا۔ اُسے میں نے آواز بدل کر حکم دیا کہ کار فوراً کمپنی میں واپس لے آؤ۔ ڈرائیور سمجھا کہ یہ فون کار کمپنی کے مالک کا تھا۔ چناں چہ وہ فوراً کار لے کر چلا گیا۔ یہ تو ہے تمہارے پہلے سوال کا جواب۔ اب دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں تمہیں اِن ویران پہاڑیوں میں قتل کر کے تمہاری لاشیں دبا دُوں گا۔“ یہ کہہ کر اُس نے پھر قہقہہ لگایا۔

نسیم اور عاقِب نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے بعد انہیں کچھ خبر نہ رہی کہ وہ کہاں ہیں۔ شاید اُن کے دماغ جواب دے گئے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ آنکھیں کھُلیں تو اپنے آپ کو ایک سجے سجائے آرام دہ کمرے میں پڑے پایا۔ قریب ہی سر فراز بیگ اور وہ عورت موجود تھے۔ عورت نے جو سر فراز بیگ کی بیوی تھی، اپنے شوہر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے خواہ مخواہ اُن بے چاروں کو ڈرایا۔ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو جاتا تو تم ساری زندگی جیل میں پڑے سڑتے۔“

”اوہو! یہ کیا جھگڑا شروع کر دیا تم نے۔“ سر فراز بیگ نے اُکتا کر کہا۔ ”یہ تقریر بند کرو اور جا کر کچھ کھانے پینے کر لے آؤ۔ جلدی کرو۔“ اس کے بعد وہ نسیم اور عاقِب سے کہنے لگا۔ ”دیکھو لڑکو! ڈرو مت، وہ سب مذاق تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم شروع سے آخر تک سب کچھ مجھے بتا دو کہ تُم کِس کے لیے کام کر رہے ہو؟ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مردان خان نے تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے۔“

"مردان خان؟" نسیم نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔ عاقِب بھی پلکیں جھپکا رہا تھا۔

"ہاں ہاں، مردان خان۔" سرفراز بیگ نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن جناب۔۔۔۔ کیا آپ ایک ایسے شخص کا ذکر کر رہے ہیں جو آپ ہی کی طرح موٹا تازہ ہے۔ اُس کی سیاہ مونچھیں ہیں، نہایت قیمتی کپڑے پہنتا ہے، منہ پر ایک بڑا سا تِل ہے اور اُس کے پاس بھورے رنگ کی کار بھی ہے۔"

"بالکل وہی۔۔۔۔۔ بالکل وہی۔" سرفراز بیگ نے اُچھل کر کہا۔ "گویا میرا اندازہ درست نکلا۔ تم لوگ اُسی کے جاسوس ہو؟"

"نہیں جناب۔ ہم اُسے نہیں جانتے۔" نسیم نے جواب دیا۔ "ایک دن ہم نوّاب جمشید علی خان کے گھر سے اپنی کار میں نکل رہے تھے کہ راستے میں اُس حُلیے کے شخص کی کار سے حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ شخص ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہمیں اُس وقت تعجّب ہوا تھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ پھر اُس

نے ہم سے نوّاب جمشید علی خان اور اُن کے سُنہری طوطے کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کی اور جب ہم نے اُسے بتایا کہ وہ طوطا چوری ہو گیا ہے تو اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جلدی سے اپنی کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ہم نے بہت سوچا، آخر وہ کون تھا اور نوّاب جمشید سے کِس لیے ملنا چاہتا تھا، لیکن کوئی بات معلوم نہ ہوئی۔ آپ نے مردان علی خان کے نام کے کسی آدمی کا ذکر کیا تو اُس مونچھوں والے اجنبی کی شکل صورت میری نظروں کے سامنے آ گئی اور میں نے محض قیاس سے کام لے کر کہہ دیا کہ اس حُلیے کا آدمی مردان خان ہی تھا۔"

"خُدا کی پناہ! تُم لوگ تو نہایت ذہین ہو۔" سرفراز بیگ کی حیرت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "اب سوال یہ ہے کہ اگر تم مردان خان کی طرف سے جاسوسی نہیں کر رہے ہو تو آخر تم پر کیا خُدا کی مار ہے کہ اُن طوطوں کے پیچھے اپنی جان جوکھوں میں ڈالے پھر رہے ہو؟"

”یہ ایک لمبی اور نہایت دلچسپ داستان ہے جناب والا۔“ نسیم نے جواب دیا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں؟“

”ہاں ہاں، اجازت ہے۔“ سرفراز بیگ نے بے چین ہو کر کہا۔ اتنے میں اُس کی بیوی ایک خُوب صُورت ٹرے ہاتھوں میں لیے اندر آئی۔ ٹرے میں چائے کے علاوہ کئی میٹھی اور نمکین چیزیں بھی تھیں۔ سرفراز بیگ اور اُس کی بیوی نے عاقِب اور نسیم کو خوب کھلایا پلایا۔ اُس کے بعد اطمینان سے نسیم نے سارا قصّہ الف سے لے کر یے تک اُسے سُنا دیا۔ سرفراز بیگ حیرت سے منہ کھولے سُنتا رہا۔ کبھی کبھی وہ بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ مارتا، کبھی مُٹھّیاں بھینچتا اور کبھی جوش میں آن کر کھڑا ہو جاتا۔

جب نسیم چُپ ہوا تو سرفراز بیگ نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ”لڑکو، معاف کرنا۔ میں تمھیں اب تک غَلَط سمجھتا رہا۔ یہ سب کارستانی اُسی بدمعاش مردان خان کی ہے۔ وہی میرے خزانے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اب میں تم لوگوں سے درخواست کروں گا کہ خُدا کے لیے میری مدد کرو۔ میں یہ بھی

وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تُم نے میری ایک گُم شدہ چیز تلاش کر دی تو میں تُمھیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ بولو، وعدہ کرتے ہو؟"

"جناب، ہم کوئی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔" نسیم نے جواب دیا۔ "اِس بات کا فیصلہ آپ کی کہانی سُن کر ہی کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی جب کہ سُراغ رساں نمبر ایک یعنی عنبر بھی یہ یقین کر لے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، وہ سچ ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" سر فراز بیگ نے کہا۔ "میں تمھیں تمام واقعات سے آگاہ کرتا ہوں۔ تم عنبر کو بتا دینا۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور میری مدد کرنے کو تیّار ہو جائے گا۔"

"لیکن جناب، یہ بھی یاد رکھیے کہ آپ نے کم از کم تین موقعوں پر قانون اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور اگر پولیس کر پتا چل جائے تو آپ مُصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔" نسیم نے بتایا۔ خوف سے سر فراز بیگ کا چہرہ ایک دم کچھ اور کالا پڑ گیا۔

”آپ نے نوّاب جمشید علی خان سے ملاقات کی۔ خود کو پولیس کا سُراغ رساں ظاہر کیا۔ یہ آپ کا پہلا جُرم تھا۔“ نسیم نے کہا۔ ”دوسرا جُرم یہ کہ آپ نے نوّاب جمشید علی خان کا طوطا چُرایا اور نوّاب صاحب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُنھیں بے بس کیا۔ تیسرا جُرم یہ کیا کہ بیگم مریم کے مکان میں بغیر اجازت داخل ہو کر اُن کا طوطا بھی چُرایا۔“

”تم لوگ تو غضب کرتے ہو۔“ سرفراز بیگ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”اب مجھے پولیس سے بچانا بھی تمھارا ہی کام ہے۔ خیر، میری داستان سُنو۔ پھر تُمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میں کِس قدر مُصیبت زدہ آدمی ہوں۔ آج سے دو سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک شخص مُجھ سے ملنے آیا۔ اُس نے اپنا نام علی جان بتایا۔ میں اُن دِنوں لندن میں تھا۔ میرا اصل کاروبار لندن ہی میں ہے۔ میں نے علی جان سے بات چیت کرتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ خاصا پڑھا لکھا آدمی ہے، لیکن کسی وجہ سے اُس کے دماغ کے پُرزے ڈھیلے ہیں۔ اُن دِنوں مُجھے کاروبار کو مزید ترقّی دینے کے لیے ایک ہوشیار اور

چالاک آدمی کی ضرورت تھی جو جگہ جگہ گھُوم پھِر کر قیمتی اور نایاب چیزیں کم داموں پر لوگوں سے خریدے تاکہ ہم اُنہیں عجائب گھروں یا نایاب اشیا کا شوق رکھنے والے دولت مند لوگوں کے ہاتھ مہنگے داموں بیچ سکیں۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کے سودے میں ہزاروں لاکھوں روپے کی آمدنی ہو جاتی ہے، لیکن اِس میں شرط یہی ہوتی ہے کہ چیز زیادہ سے زیادہ قیمتی اور پُرانی ہو اور اگر اس کے ساتھ کسی بڑے آدمی کا نام بھی لگا ہوا ہو تو منہ مانگی قیمت گاہک سے مل جاتی ہے۔ جیسے کسی عظیم آرٹسٹ کی کوئی تصویر یا کسی بادشاہ، مشہور شاعر یا ادیب کا کوئی لباس یا تحریر وغیرہ۔ انہی چیزوں میں ہیرے جواہر کو بھی شامل کر لو۔ خیر، یہ شخص علی جان ایسی ہی نایاب اور نادر چیزوں کی پہچان اور خرید و فروخت کا خاصا وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ نادر چیزوں کی پہچان کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جعل ساز نقلی چیزیں بھی ایسی کاری گری بناتے ہیں کہ ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔

غرض میں نے علی جان کو ملازم رکھ لیا۔ یہ شخص اپنے کام میں ہوشیار ثابت

ہوا اور شروع شروع میں اُس نے بڑی محنت سے کام کیا۔ وہ باقاعدگی سے نیلام گھروں میں جاتا اور وہاں سے پُرانی چیزیں سستے داموں خرید لاتا جنہیں لندن میں ہم اُونچی قیمت پر شوقین مزاج گاہکوں کے کے ہاتھ بیچتے تھے۔

ایک دن علی جان کسی نیلام گھر سے ایک تصویر خرید لایا۔ دیکھنے میں یہ بہت معمولی تصویر تھی، اس میں دو پیلے سروں والے طوطے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھے دکھائے گئے تھے۔ میں نے علی جان سے پوچھا، تصویر کے کتنے پیسے دیے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ یہ تصویر پانچ ہزار پونڈ میں اتّفاق سے مل گئی اور سمجھیے کہ یہ بہت سستی ملی۔ میں نے حیرت۔ میں نے حیرت سے اُس معمولی تصویر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ مجھے وہ کسی رُخ سے پانچ ہزار پونڈ مالیت کی نظر نہ آئی۔ میں نے طیش میں آن کر کہا: علی جان، تُم مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ چند ٹکوں کی ایک معمولی تصویر اُٹھا لائے اور اب کہتے ہو کہ پانچ ہزار پونڈ میں لی ہے۔ کیا میں نے تمھیں اس لیے ملازم رکھا

تھا کہ یوں ہزاروں پونڈ کی رقمیں برباد کرتے رہو۔

وہ چُپ چاپ کھڑا سُنتا رہا اور میں دیر طرح اُسی طرح بکتا جھکتا رہا۔ جب میں خاموش ہوا تو اُس نے کہا کہ بیگ صاحب، اگر آپ بے وقوف نہیں ہیں تو میں بھی اتنا احمق نہیں ہوں کہ کسی تصویر کے پانچ ہزار پونڈ دے آؤں۔ یہ نہایت بیش قیمت تصویر ہے، جسے آپ دُنیا کے کسی بھی بڑے عجائب گھر کے ہاتھ کم از کم ایک لاکھ ڈالر میں بیچ سکتے ہیں اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ تصویر بے حد قیمتی اور پُرانی ہے۔

علی جان کی یہ بات سُن کر مُجھے اور غصّہ آیا کہ خواہ مخواہ بات بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور مجھے واقعی بے وقوف سمجھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ مجھے اپنی منحوس صورت نہ دِکھانا۔ میرے اس سلوک پر بھی وہ نہیں گیا اور یہی کہتا رہا کہ بیگ صاحب آپ چوں کہ اس وقت غصّے میں ہیں، اس لیے میری بات پر غور نہیں کر رہے۔ یہ جو تصویر میں آپ کو دو طوطے دکھائی دے رہے ہیں، اصل تصویر اُن

کے نیچے ہے اور وہی تصویر قیمتی ہے۔ اس کو چھُپانے کے لیے آرٹسٹ نے اِس پر دوسری تصویر طوطوں کی بنا دی ہے۔ میں ایک خاص کیمیائی عمل سے اُوپر والی تصویر صاف کر دوں گا اور نیچے سے دوسری تصویر نکل آئے گی۔

یہ کہہ کر اس نے وہ تصویر بغل میں دبائی اور چلا گیا۔ میں نے اُس وقت بھی علی جان کی بات پر کوئی توجّہ نہ دی۔ چند دن بعد وہ پھر میرے پاس آیا اور ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ یہ ایک نوجوان چرواہے کی تصویر تھی جس نے اپنی گود میں بھیڑ کا بچّہ اُٹھا رکھا تھا۔ تصویر پر ایک نگاہ ڈالتے ہی میں اُچھل پڑا۔ یہ دنیا کے ایک مشہور آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر تھی جس کا نام ایمبراس تھا۔ نیویارک کے عجائب گھر نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ اس تصویر کی قیمت دو لاکھ امریکی ڈالر ادا کرنے کے لیے تیّار ہے۔ مجھے حیران پریشان دیکھ کر علی جان نے کہا، کیوں جناب؟ اب کیا رائے ہے آپ کی۔ وہ پانچ ہزار پونڈ میں نے ضائع کیے یا کچھ کما کر دکھایا؟ میں نے علی

جان سے معافی مانگی اور کہا کہ وہ پچھلی باتوں کو بھول جائے۔ اور دوبارہ کام شروع کر دے، مگر اُس نے انکار کر دیا اور تصویر بغل میں دبا کر بولا، نہیں بیگ صاحب، اب میں آپ کے ہاں نوکری نہیں کروں گا۔ آپ تو مجھے نکال چکے ہیں۔ اب یہ میری ملکیّت ہے اور میں خود اِسے دو لاکھ ڈالر میں بیچوں گا۔ یہ سُن کر مُجھے غصّہ آیا اور میں نے کہا کہ کیا بکواس کرتے ہو۔ تم نے یہ تصویر میری دی ہوئی رقم سے خریدی تھی اور میں قانونی طور پر اِس کا مالک ہوں۔

علی جان نے کہا، ٹھیک ہے روپیہ آپ کا تھا۔ لیکن اصل تصویر کو خریدنے والا تو میں ہوں۔ اگر میں اِسے نہ خریدتا تو آپ اسے دو لاکھ ڈالر میں کیوں کر بیچ سکتے تھے۔ بہر حال، میں اب یہ چاہتا ہوں کہ تصویر جس قیمت پر بِکے، اس میں سے آدھی رقم میرے حوالے کی جائے۔"

"بات تو اُس کی معقول تھی۔" نسیم نے کہا۔

سرفراز بیگ نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "مجھے علی جان کی بات

مان لینی چاہیے تھی۔ لیکن کیا بتاؤں۔ اُس وقت لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میں نے علی جان کو دھمکی دی کہ اگر تُم نے تصویر مجھے نہ دی تو میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ یہ سُنتے ہی وہ رفو چکّر ہو گیا۔ کہیں اُس کا پتا نہ لگا۔ میں نے پولیس میں رپٹ درج کرا دی کہ میرا ملازم علی جان ایک قیمتی تصویر لے کر بھاگ گیا ہے۔ پولیس نے اُس کا سُراغ لگانے کی بڑی کوشش کی، لیکن ناکام رہی۔ پھر کئی ماہ گزر گئے۔ ایک دن مُجھے پتا چلا کہ علی جان پولیس کی نظروں سے چھُپ چھپا کر انگلستان سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور وہ قیمتی تصویر بھی اُس کے قبضے میں ہے۔ پھر معلُوم ہوا کہ آج کل وہ پاکستان میں ہے، چناں چہ میں فوراً یہاں آن پہنچا۔ اس کے بعد کے واقعات تم لوگوں کو معلوم ہی ہیں۔"

"جی ہاں۔" نسیم نے کہا۔ "علی جان کو طوطے بیچنے والے خُدا بخش نے اپنے گھر میں پناہ دی۔ اُس کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ علی جان بیمار ہونے کے باعث کسی ذہنی بیماری کا شکار بھی ہو گیا تھا۔ اُس کے قبضے میں جو ڈبّا تھا، غالباً

وہ تصویر اُسی میں تھی۔ اُس نے شاید ایک خط بھی آپ کو لکھا تھا۔"

"ہاں۔ اُسی خط سے تو مجھے پتا چلا تھا کہ علی جان پاکستان پہنچ چکا ہے۔" سرفراز بیگ نے بتایا۔ "خط میں اس نے لکھا تھا کہ فلاں جگہ پہنچ کر طوطے بیچنے والے ایک شخص خُدا بخش کو تلاش کر کے ایک ہزار روپیہ اُسے دُوں۔ اس کے عوض وہ زرد رنگ کے سروں والے سات طوطے میرے حوالے کرے گا۔ ان طوطوں کو معلوم ہے کہ وہ قیمتی تصویر کہاں ہے اور طوطے ایک ایک جملہ بولنا جانتے ہیں۔ اُن جملوں کی مدد سے اُس مقام کا پتا لگایا جا سکتا ہے جہاں علی جان نے اُس تصویر کو چھپایا ہے۔ جب میں خُدا بخش کے گھر پہنچا تو اُس نے یہ بتا کر مجھے مایوس کر دیا کہ علی جان مر چکا ہے اور خُدا بخش نے میرا انتظار کرنے کے بعد، مایوس ہو کر، وہ ساتوں طوطے فروخت کر دیے ہیں۔ میں نے پھر بھی ہمّت نہ ہاری اور اُن طوطوں کا سُراغ لگانے نکل کھڑا ہوا۔ اب تک پانچ طوطے میرے قبضے میں آ چکے ہیں۔ دو باقی ہیں۔ جب وہ ساتوں میرے پاس ہوں گے تو اُن کے رٹے

رٹائے جملے سمجھ کر اُس تصویر کا سُراغ لگانا کُچھ مُشکل نہ ہو گا۔ لیکن اب ایک مُصیبت یہ آن کھڑی ہوئی ہے کہ میرے ایک کاروباری حریف مردان خان کو بھی اُس تصویر کا کچھ کُچھ عِلم ہو چکا ہے اور وہ اِسے ہتھیانے کی فکر میں ہے۔ اگر وہ مُجھ سے پہلے اُس تصویر کو تلاش کرنے میں کام یاب ہو گیا تو یہ میری ایسی شکست ہو گی کہ میں ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔"

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ دیر تک چاروں میں سے کوئی نہ بولا۔ سرفراز بیگ بے چینی سے اپنا ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "میں نے اُس لڑکے کو ایک طوطا پنجرے میں بند لے جاتے دیکھا جو بعد میں نیلی کار میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔ اُس وقت میں بڑی کشمکش میں پھنس گیا تھا۔ خیال آیا کہ اُس لڑکے کا پیچھا کر کے طوطا چھین لوں۔ پھر سوچا نہیں، تمہارا تعاقب کروں۔ میں تمہیں مردان خان کا جاسوس سمجھ رہا تھا اور میرا خیال تھا تم سے بہت سی قیمتی باتیں معلوم ہوں گی۔ اس لیے میں نے اُس طوطے

والے لڑکے کا خیال چھوڑا اور تمہیں اغوا کر کے یہاں لے آیا۔ خوش قسمتی سے جب وہ لڑکا طوطے کا پنجرا لیے میرے نزدیک سے گُزرا تو طوطے نے ایک جملہ کہا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ جملہ ایک کاغذ پر لکھ لیا تھا۔ دیکھو یہ ہے۔" سرفراز بیگ نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر نسیم اور عاقِب کی طرف بڑھایا۔ دونوں نے اُس پر نگاہ ڈالی۔ لکھا تھا:

"میں درخت کے نزدیک کبھی نہیں جاؤں گا۔"

"کیا مطلب؟" لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس جملے کا مطلب تبھی سمجھ میں آئے گا جب ساتوں طوطوں کے جملے ہمارے پاس ہوں گے۔ پانچ طوطے میرے پاس ہیں لیکن وہ کم بخت پروں میں گردنیں دبائے بیٹھے ہیں اور اُنہوں نے کبھی نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

پُراسرار پیغام

دو گھنٹے بعد وہ ویَن میں بیٹھے ہیڈ کوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ پانچوں طوطوں کے پنجرے اُنھوں نے گاڑی کے پیچھے رکھ دیے تھے۔ نسیم اور عاقِب نے سرفراز بیگ کو بتایا کہ یہ معمّا ایسا ہے کہ اُسے سُراغ رساں نمبر ایک یعنی عنبر ہی حل کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اب اُسی کے پاس جانا چاہیے۔ ہیڈ کوارٹر میں کالا طوطا بھی موجود ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہ چھ طوطے بول پڑیں اور علی جان نے اُنہیں جو جملے پیغام کی صورت میں رٹائے ہیں، وہ بتا دیں۔ ساتواں پیغام بھی اُن چھ پیغاموں کے بعد خود بخود

سمجھ میں آسکتا ہے۔

انہیں ایک لمبے پہاڑی اور خطرناک راستے سے گُزر کر ہیڈ کوارٹر پہنچنا تھا۔ یہاں اونچے نیچے بے شمار ٹیلے تھے اور تنگ سڑک انہی ٹیلوں کے درمیان میں سے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی گزرتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب ہزاروں فٹ گہری کھائیاں اور خندقیں تھیں۔ ڈرائیور اس راستے پر احتیاط سے گاڑیاں چلاتے تھے۔

سرفراز بیگ کی بیوی بہت اچھی ڈرائیور تھی۔ اِس مرتبہ بھی وہی وین چلا رہی تھی۔ اُس کا شوہر برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور دونوں لڑکے پنجرے سمیت پچھلی سیٹوں پر چُپ چاپ بیٹھے اُن عجیب حالات پر غور کر رہے تھے۔ یکایک ایک خطرناک تنگ موڑ کاٹتے ہوئے سرفراز بیگ کی بیوی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اُس نے فوراً بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ سڑک کے درمیان کئی من وزنی ایک پتھّر پڑا تھا۔ اگر گاڑی کی رفتار ذرا تیز ہوتی تو خوف ناک حادثہ ہونے کا امکان تھا۔ پتھّر نے آدھی سڑک روک

رکھی تھی اور پرلی طرف سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

ابھی سرفراز بیگ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ سیاہ کار میں سے تین آدمی باہر نکلے۔ اُن کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ وین کے نزدیک آن کر اُن میں سے ایک آدمی نے قہقہہ لگا کر سرفراز بیگ سے کہا۔

"تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔" یہ کہہ کر اُس نے ساتھیوں سے کہا۔ "گاڑی کا دروازہ کھولو۔ پچھلی سیٹ پر پانچ پنجرے رکھتے ہیں۔ انہیں اُٹھا کر اپنی کار میں رکھ لو۔ خبردار! اِن لوگوں میں سے کوئی حرکت کرے تو فوراً گولی مار دینا۔"

"مردان خان! تُم نے یہ حرکت اچھّی نہیں کی۔" سرفراز بیگ نے کہا "اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یوں دھونس جما کر وہ قیمتی تصویر حاصل کر لوگے تو تُم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ پولیس تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔"

"ہاہاہا۔۔۔۔۔! پولیس۔" مردان خان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "پولیس میرا

بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ مر دان خان پر ہاتھ ڈالنا بچّوں کا کھیل نہیں۔ ایک طوطا میرے قبضے میں پہلے سے ہے، اِس بے وقوف لڑکے نے وہ خود ہی مجھے دے دیا۔ اب پانچ طوطے تُم سے لیے جاتا ہوں۔ باقی رہا ساتوں تو اُس کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

نسیم نے مر دان خان اور اُس کے ڈرائیور کو فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جس نے اللہ داد سے تُو تُو میں میں کی تھی۔ اُس نے جھٹ پٹ پانچوں پنجرے وین میں سے نکال کر سیاہ کار کی ڈِکّی میں رکھ دیے۔

"جاؤ، اب ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر سدھارو۔" مر دان خان نے سر فراز بیگ سے کہا۔ "اور دیکھو! پولیس کے پاس جانے کی کوشش کرو گے تو خود مُصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ پولیس والے تُم سے پوچھیں گے کہ نوّاب جمشید علی خان کا طوطا کِس نے چُرایا تھا، اور نوّاب صاحب کے ہاتھ پاؤں کِس نے باندھے تھے؟ تُمھارے خلاف گواہی یہ لڑکے بھی دیں گے۔ ہاہا ہا!" وہ قہقہے لگاتا ہوا اپنی کار میں جا بیٹھا اور چند لمحوں بعد سیاہ کار اپنے پیچھے

سرمئی رنگ کا دھواں چھوڑتی ہوئی پہاڑیوں میں غائب ہو گئی۔

دیر تک اُن لوگوں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بڑی مُصیبت یہ تھی کہ وہ سیاہ کار کا پیچھا بھی نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ راستے میں وہ پتھّر پڑا تھا۔ اُنہوں نے بڑی مشکل سے اپنی گاڑی پیچھے موڑی اور واپس اُسی راہ پر چل دیے جدھر سے آئے تھے۔ سرفراز بیگ اتنا بدحواس اور پریشان تھا کہ اُس نے لڑکوں کے ہیڈ کوارٹر جانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اُس نے نسیم اور عاقِب سے کہا کہ وہ چلے جائیں اور عنبر کو سارا حال بتا کر آپس میں مشورہ کریں۔ اگر وہ اس تصویر کا سُراغ لگانے میں کام یاب ہو گئے تو دس ہزار روپے کا انعام حاصل کر سکیں گے۔

نسیم اور عاقِب ہیڈ کوارٹر میں پہنچے تو عنبر اُن کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا۔ اُن کو دیکھ کر اِطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگا:

”اتنی دیر کہاں لگا دی تُم نے؟ اور وہ طوطے کہاں ہیں جو تُم خریدنے گئے تھے؟“

”اجی یہاں تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ چکے ہیں اور تمھیں ان منحوس طوطوں کی فکر پڑی ہے۔“ نسیم نے کُرسی سے گرتے ہوئے کہا۔ ”بس سمجھو کہ جان بچ گئی اور خیر سے بُدھو گھر کو آئے۔“

اس کے بعد اُن دونوں نے عنبر کو شروع سے آخر تک تمام داستان سُنائی۔ وہ چُپ ہوئے تو عنبر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا:

”معاملہ کچھ اور بگڑ گیا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ شخص اپنی خفیہ سرگرمیوں میں لگا ہوا ہے۔ اب وہ کھُل کر سامنے آ گیا ہے۔ اُس کا نام مردان خان ہے اور طوطے اُس کے قبضے میں ہیں۔ جب کہ ساتواں طوطا کالا ڈاکو ہمارے پاس ہے۔۔۔“

”میں کالا ڈاکو ہوں۔۔۔۔ میں کالا ڈاکو ہوں۔“ سامنے پنجرے میں بند طوطا ایک دم چلّایا۔ ”میں مغرب کی طرف سو قدم کے فاصلے پر تیر چلاتا ہوں۔۔۔۔۔ میں مغرب کی طرف۔۔۔۔۔“ طوطا دیر تک یہی ایک جملہ دُہراتا رہا۔ تینوں لڑکے حیرت سے منہ کھولے طوطے کی جانب دیکھ رہے

تھے۔

”جلدی کرو۔ یہ جملہ ایک کاغذ پر لکھ لو۔“ عنبر نے چونک کر عاقِب سے کہا۔ اس نے فوراً نوٹ بُک نکالی اور طوطے کا کہا ہوا جملہ لکھ لیا۔ ”آؤ، اب دیکھیں کہ ہمارے پاس اِن طوطوں کے کہے ہوئے کتنے جُملے موجود ہیں۔ پھر اُن پر غور کریں گے۔“ عنبر نے کہا۔ عاقِب نے جلدی جلدی اپنی نوٹ بُک کے ورق اُلٹنے شروع کیے۔ مختلف جگہوں پر اُس نے اُن طوطوں کے بارے میں معلومات جمع کر رکھی تھیں۔ اتنے میں طوطے نے ایک اور بات کہنی شروع کر دی:

”میں کالا ڈاکو ہوں۔۔۔۔۔ میں کالا ڈاکو ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ میں نے اپنا خزانہ۔۔۔۔۔ قبرستان میں دبا دیا۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ ہُو ہُو ہُو۔۔۔۔۔ میں کالا ڈاکو ہوں۔۔۔۔۔ میں نے اپنا خزانہ۔۔۔۔۔“

”خدا کی پناہ!“ نسیم چیخا۔ ”یہ جملہ میں نے پہلے بھی اِس طوطے کی زبان سے سُنا ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔ یہ دیکھو۔“ عاقِب نے اپنی نوٹ بُک کے ایک صفحے پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ جُملہ میں نے یہاں درج کر لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علی جان نے کالے ڈاکو کو دو جملے سکھائے تھے۔“عنبر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اب یاد آیا، خُدا بخش نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک طوطا مر گیا تھا اور اُس کے مرنے کے بعد علی جان نے کہا تھا کہ کوئی بات نہیں، یہ کالا ڈاکو مرنے والے طوطے کی جگہ بھی کام کرے گا۔ اب اُس کی بات میری سمجھ آئی ہے۔“

”یہ لیجیے، اِن ساتوں طوطوں کے نام بھی نکل آئے جو ہمیں محمّد دین نے بتائے تھے، دراصل طوطوں کے یہ نام اُس کے چچا نے نہیں رکھے تھے بلکہ علی جان نے رکھے ہوں گے۔ نوّاب جمشید علی خان کے طوطے کا نام سُنہری خان تھا اور بیگم مریم کے طوطے کا نام پُوپُو۔ اُن کے علاوہ ایک طوطے کا نام بہرام اور ایک کا سلطانہ۔ پانچویں اور چھٹے طوطے کا نام کپتان باز بہادر اور بزدل کانا اور ساتوں نام کالا ڈاکو تھا۔ اور یہ دیکھیے۔۔۔۔

نوّاب جمشید علی خان کا طوطا جو جملہ بار بار کہتا تھا، وہ میں نے یہاں لکھ لیا تھا:
میرا نام سنہری خان ہے۔۔۔۔ میں کون ہوں اور کون کون نہیں۔۔۔۔ میرا نام سنہری خان ہے۔۔۔۔ میں کون ہوں ہے اور کون نہیں۔۔۔۔"

"خوب! بہت خوب!" عنبر نے اُچھل کر کہا۔

"اور جاوید اختر کے پاس جو طوطا تھا، وہ کوئی جملہ نہیں بولتا تھا۔" عاقِب نے بتایا۔ "البتّہ گالیاں بہت دیتا تھا۔"

"گالیاں؟" عنبر نے بھویں سُکیڑ کر پوچھا۔ "گالیاں بہت دیا تھا! کس قسم کی گالیاں؟"

"اُلّو کا پٹھّا۔۔۔ اُلّو کا پٹھّا۔۔۔ اُلّو کا پٹھّا۔۔۔۔۔" عاقِب نے جواب دیا۔

"سبحان اللہ! تُم نے کس خوب صورتی سے عنبر کو اُلّو کا پٹھّا کہا ہے۔" نسیم

نے ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تم ہماری لڑائی کروا دو گے۔" عاقِب نے کہا۔ "میں بھلا عنبر کو اُلّو کا پٹھّا کیوں کہنے لگا؟ یہ تو میں نے اُس طوطے کی گالی بتائی ہے جو وہ چیخ چیخ کر جاوید اختر کو دے رہا تھا۔"

"ہاں، یاد آیا۔" نسیم نے کہا۔ "جاوید اختر بے چارہ طوطے سے گالیاں کھا کر کیسا شرمندہ ہو رہا تھا۔"

انہوں نے طوطوں کے کہے ہوئے تمام جملے کاغذ پر لکھ لیے، لیکن اُن کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ دیر تک اُس عبارت کا مطلب جاننے کے لیے سر کھپاتے رہے لیکن ہر بار ناکامی نے اُن کا منہ چڑایا۔ تھک ہار کر نسیم نے وہ کاغذ مروڑ کر پرے پھینک دیا۔

"اجی لعنت بھیجو اِس بکواس پر۔" اس نے منہ کھول کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "بس سمجھ لو کہ ایک وہ علی جان پاگل تھا جس نے اِن طوطوں کو یہ بے کار سے جملے یاد کرائے اور دوسرے بنے بنائے بے وقوف ہم ہیں جو خواہ

مخواہ مغز ماری کر رہے ہیں۔ اُن جملوں سے تو کہیں بہتر تھا کہ اپنے طوطوں کو نوّاب جمشید علی خان کی طرح علامہ اقبال یا مرزا غالب کا کلام یاد کرتا۔"

عنبر نے گھور کر نسیم کو دیکھا اور مُڑا تڑا کاغذ اُٹھا کر دوبارہ اپنے سامنے رکھ لیا۔ یکایک اُس کے ذہن میں ایک نرالا خیال آیا۔ وہ مدّھم آواز میں کہنے لگا:

"قبرستان۔۔۔۔ خزانہ۔۔۔۔ درخت۔۔۔۔ اُلّو کا پٹھّا۔۔۔۔"

نسیم نے عاقِب کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "خُدا خیر کرے۔ سُراغ رساں نمبر ایک کا دماغ بھی چل گیا۔"

عاقِب مُسکرایا، لیکن اُس نے نسیم کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اچھّی طرح جانتا تھا کہ عنبر نے ضرور اُس بے معنی عبارت کا کوئی مطلب نکال لیا ہے۔ آخر کار عنبر نے گہرا سانس لیا اور عاقِب سے کہا: "ذرا مہربانی کر کے اِس الماری میں سے شاداب نگر کا نقشہ تو نکال لاؤ۔ میں اپنا ایک شک دُور کرنا چاہتا ہوں۔"

عاقِب نے شاداب نگر کا لمبا چوڑا نقشہ نکال کر عنبر کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ دیر تک نقشے پر نگاہیں جمائے دیکھتا رہا۔ پھِر اُس نے ایک جگہ اُنگلی رکھی اور خوشی سے چلّایا:

"مِل گیا! مِل گیا!"

"کیا مِل گیا؟ خزانہ؟" نسیم نے مُنہ بنا کر کہا۔

"خزانہ نہیں۔۔۔۔ قبرستان۔۔۔۔ قبرستان۔۔۔۔" عنبر نے بتایا۔

"لاحول ولا۔۔۔۔۔ قبرستان ملنے کی اِتنی خوشی کرتے کسی کو ہم نے دیکھا نہ سُنا۔ ارے بھائی، قبرستان کے نام سے لوگ ڈرتے ہیں اور تُم خوشی سے جھُوم رہے ہو؟"

"بات ہی خوشی کی ہے۔" عنبر نے کہا۔ "مجھے یقین ہے یہ معمّا وہیں جا کر حل ہو گا۔ یہ دیکھو۔۔۔۔ یہی وہ آبادی ہے جہاں خُدا بخش طوطے والا رہتا ہے۔" اُس نے نقشے پر ایک جگہ پنسل سے نشان بناتے ہوئے اپنے

ساتھیوں کو بتایا۔ "اور یہ وہ اُجاڑ سا قبرستان ہے جہاں دن کو بھی اُلّو بولتے ہوں گے۔"

"خدا کی پناہ!" نسیم نے اُچھل کر کہا۔ "ارے! اب مجھے بھی یاد آیا۔۔۔۔ بہت دِن ہوئے میں پہلے بھی ایک مرتبہ اپنے چچا کے ساتھ اس علاقے میں جا چکا ہوں۔ وہاں سے دو نہریں بھی گُزرتی ہیں اور اِرد گرد کی زمین خاصی دلدلی ہے۔ وہیں ایک ویرانے میں وہ قبرستان ہے۔ دِن میں بھی اُدھر سے گُزرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے علی جان نے وہ قیمتی تصویر اُسی قبرستان میں کہیں چھپا دی ہو۔"

"ہاں، ہو سکتا ہے۔" عنبر نے ٹیلے فون کا ریسیور اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ اور بھی ممکن ہے کہ خود علی جان کی قبر بھی اُسی قبرستان میں ہو۔" یہ کہہ کر اُس نے کوئی نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو! دیکھیے، میں عنبر بول رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر کار بھجوا دیجیے۔ صادق مرزا ڈرائیور کے بجائے اگر اللہ داد کو روانہ کر سکیں تو شکر گزار ہوں گا۔"

اُس نے فون بند کر دیا۔ ”خُدا کا شکر ہے اللہ داد ڈرائیور ڈیوٹی پر آ گیا ہے۔ کمپنی والوں نے کہا ہے کہ وہ چند منٹ تک مرسیڈیز کار ہمارے لیے بھیج رہے ہیں۔ بس تم لوگ فوراً چلنے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔“

پھر اُس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”سورج ڈوبنے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی ہے۔ میں اُس قبرستان میں زیادہ دیر نہ لگاؤں گا۔ اُمّید تو یہی ہے کہ ہم اندھیرا بڑھنے سے پہلے پہلے اپنے مقصد میں کام یاب ہو کر واپس آ جائیں گے۔“ اتنے میں باہر سے مرسیڈیز کا ہارن بجنے کی آواز آئی۔ وہ تینوں لپکے ہوئے باہر گئے۔ اللہ داد ڈرائیور کار کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔

”سلام، میاں۔“ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر عنبر کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، اللہ داد۔“ عنبر نے جواب دیا۔ ”کہو خیریت ہے؟ تُم ہمیں بتائے بغیر ہی چھٹّی پر چلے گئے تھے۔ پھر آ بھی گئے؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ معاملہ ہی کُچھ ایسا تھا کہ مُجھے چھٹّی منسوخ کر کے کمپنی میں حاضر ہونا پڑا۔ فرمایئے، کِدھر چلنے کا ارادہ ہے!“

عنبر نے اُسے پتا سمجھایا۔ اللہ داد کی پیشانی پر حیرت کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ لیکن اُس نے زبان سے کُچھ نہ کہا۔ اُس نے تینوں لڑکوں کو کار کی نرم آرام دہ سیٹوں پر بٹھایا پھر بے آواز انجن اسٹارٹ کیا اور نئ چمکیلی مرسیڈیز کار پُرانے شاداب نگر کی جانب روانہ ہوئی۔ عنبر اپنی عادت کے مطابق نِچلا ہونٹ نوچ رہا تھا اور یہ اِس بات کی علامت تھی کہ گہری سوچ میں اپنے آپ کو گُم کر چکا ہے۔ نسیم اور عاقِب بھی خاموش بیٹھے تھے۔

جب اُن کی کار قبرستان کے قریب پہنچی تو شام کے سائے گہرے ہو چُکے تھے اور توقّع کے خلاف اُنہیں یہاں تک پہنچنے میں خاصی دیر لگ گئی تھی۔ ابھی واپس بھی جانا تھا۔

ایک اُجاڑ ویران سی جگہ میں عنبر نے اللہ داد کو کار روکنے کا حکم دیا۔ قریب ہی درختوں کا ایک جھنڈ تھا، لیکن درختوں پر کوئی ہری بھری شاخ تھی نہ بھول پتّے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اُس جھُنڈ سے کُچھ فاصلے پر ایک بڑا سا درخت الگ تھلگ کھڑا تھا۔ عنبر نے کچھ سوچ کر کہا:

"بہتر ہے تُم گاڑی اُس درخت کے نیچے روکو۔"

اللہ داد نے دوبارہ کار چلائی اور لے جا کر اُسی درخت کے نیچے روک دی۔ یہاں سے قبرستان کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔

"اللہ داد، ممکن ہمیں کُچھ دیر ہو جائے۔ گھبرانا مت۔ ہمیں فی الحال کوئی خطرہ تو نہیں، مگر تُم ذرا اِدھر اُدھر نگاہ رکھنا۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص پریشان کرنے کی کوشش کرے۔ خطرے کی صورت میں ہم فوراً واپس آئیں گے یا تمہیں کسی طریقے سے اِطّلاع کر دیں گئے۔" عنبر نے کہا۔

قبرستان کے اِرد گرد چار دیواری تھی۔ بہت بوسیدہ اور پُرانی۔ تینوں لڑکے دبے پاؤں چار دیواری کی طرف بڑھے اور اُس پر چڑھ کر قبرستان میں کود گئے۔ وہاں بے شُمار نئ اور پُرانی قبریں تھیں لیکن زیادہ تر پرانی قبریں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قبرستان اُن کے اندازے کے خلاف بہت وسیع جگہ میں پھیلا ہوا تھا اور وہاں اتنا گہرا سنّاٹا تھا کہ لڑکے ایک دوسرے کے سانس لینے کی آواز بھی سُن رہے تھے۔ اکثر

قبریں زمین میں دھنس چکی تھیں اور اُن کے آس پاس جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔

یکایک، چند قدم کے فاصلے پر، بھورے رنگ کا ایک نیولا قبر سے نِکل کر بھاگا اور دوسری قبر کے ایک بِل میں گھُس گیا۔ اُس کی ننھی ننھی لال لال آنکھیں تیزی سے پھیلنے والے اندھیرے میں انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ نیولے کو دیکھ کر نسیم نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا: ''میں نے سُنا ہے جس جگہ نیولے ہوتے ہیں، وہاں سانپ بھی پائے جاتے ہیں۔''

''ہاں، تُم نے دُرست سُنا ہے۔'' عنبر نے جواب دیا۔

''ہم سے بڑی غَلَطی ہوئی۔'' عاقِب نے کہا۔ ''چلتے وقت کم از کم ایک ٹارچ ہی لے آتے۔''

''ہاں واقعی، ٹارچ لانا یاد ہی نہ رہا۔'' عنبر نے کہا۔

''مگر طے تو یہ ہوا تھا کہ اندھیرا بڑھنے سے پہلے ہی ہم گھر واپس پہنچ جائیں

گے۔"نسیم نے گھبرا کر کہا

"نہیں۔۔۔۔۔اب میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم یہیں رُکیں گے۔"عنبر نے کہا اور نسیم چلتے چلتے ایک دم رُک گیا۔

"یہیں رہیں گے ؟اِس قبرستان میں ؟"

"میرا مطلب ہے وہ تصویر ڈھونڈ کر ہی چلیں گے۔خواہ اندھیرا ہی کیوں نہ ہو جائے۔"عنبر نے اُسے سمجھایا۔

"اور خواہ کوئی مُردہ قبر سے اُٹھ کر ہمیں کھا جائے ؟"نسیم نے کہا۔عنبر نے گھُور کر اُسے دیکھا اور کہا۔"مُردے انسانوں کو کھایا نہیں کرتے۔"

عنبر کی رہنمائی میں وہ مغرب کی جانب بڑھے چلے جا رہے تھے۔

اب وہ قبرستان کے عین درمیان میں پہنچ چُکے تھے۔ہر طرف ویرانی تھی اور گہری خاموشی،قبروں کے درمیان میں سے دائیں بائیں پیدل چلنے کے لیے دو پگ ڈنڈیاں سی بنی ہوئی تھیں۔عنبر ایک لمحے کے لیے یہاں رُکا اور

جیب سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکال کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

"اگر یہاں سے ایک تیر کمان میں جوڑ کر چھوڑا جائے تو اُس کا پہلا نشانہ کہاں ہو گا؟" اُس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اُس کا رُخ اب شمال کی طرف تھا۔ "اگر وہ تیر یہاں سے سو قدم کے فاصلے پر جا کر گرے تو اِس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمیں پورے سو گز یا تین سو فٹ اور آگے بڑھنا چاہیے۔"

ایک بار پھر وہ آگے چلے اور قدم گنتے رہے۔ پورے سو قدم گننے کے بعد جب وہ رُکے تو اُن کے بالکل پاس تین ایک جیسی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ عنبر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُن قبروں پر لگے ہوئے کتبے پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پتھر کے اُن کتبوں پر دھول کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے جیب سے رومال نکال کر ایک کتبے سے گرد جھاڑی۔ اُس پر لکھا تھا:

یہاں دُنیا کا ایک بڑا مصوّر دفن ہے جس نے اپنی زندگی میں سینکڑوں خوب صورت تصویریں بنائیں۔

لیکن افسوس کہ وہ اپنی تصویر نہ بنا سکا۔ اُسے ایک بے
رحم شخص نے قتل کر دیا۔۱۷

جون ۱۸۷۷ء

"خُدا کی پناہ! یہ قبر تو کوئی سو سال پرانی ہے۔" نسیم نے آہستہ سے کہا۔
"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں سے بھاگ چلو۔ پھر کبھی دِن کی روشنی میں آ
جائیں گے۔"

"تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔" عنبر نے جواب دیا۔ "میں جس کام کے لیے آیا
ہوں، وہ مکمّل کر کے ہی جاؤں گا۔" اتنے میں ایک بھیانک آواز قبرستان
میں گونجی:

"ہُو ہُو ہُو۔۔۔۔ ہُو ہُو ہُو۔۔۔۔" نسیم نے عنبر کا بازو تھام لیا۔ عاقِب نے
اُسے سمجھایا۔ "اُلّو ہے، اُلّو۔"

عنبر نے درخت پر نگاہیں جما دیں۔ اُسے اندھیرے میں اُلّو کی زرد زرد

گھومتی ہوئی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ یکایک ایک نرالا خیال بجلی کی طرح اُس کے ذہن میں آیا۔ وہ لپکا ہوا اُس درخت کی طرف گیا۔ نسیم اور عاقِب اُس کے پیچھے پیچھے تھے۔

"اب کیا اُلّوؤں سے دوستی گانٹھنے کا ارادہ ہے؟" نسیم نے فقرہ کسا۔ عنبر نے کوئی جواب نہ دیا اور جھک کر درخت کے تنے کے ساتھ ساتھ نرم زمین کو دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے حیرت اور خوشی کی چیخ نکلی۔ پھِر اُس نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے مٹّی کھودنی شروع کر دی۔

"اب واقعی اُلّو بن گئے۔۔۔" نسیم نے کہا اور خود بھی عنبر کے ساتھ مل کر مٹّی کُریدنے لگا۔ عاقِب بھلا کب پیچھے ہٹنے والا تھا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔

وہ آ گئے

اُن تینوں نے مل کر بہت جلد دو ڈھائی فٹ گہری مٹّی کھود ڈالی۔ اب وہ ہاتھوں کے بجائے نوکیلے پتھّروں سے کام لے رہے تھے۔ یکایک اُن کے ہاتھ لوہے کی کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائے۔ تھوڑی دیر بعد لوہے کی مضبوط چادر کا بنا ہوا ایک صندوقچہ سا اُن کے ہاتھوں میں تھا۔

"مل گیا۔۔۔۔ مل گیا۔۔۔" نسیم نے چلّا کر کہا۔

یہ وہی ڈبّا ہے جس میں علی جان نے وہ قیمتی تصویر چھپائی تھی۔

ڈبّے کے منہ پر لوہے کا ایک بڑا قفل لگا تھا اور قُفل کی چابی ندارد تھی۔ تینوں اُسے کھولنے کے لیے اچانک بے چین تھے۔

اچانک اُنھوں نے اپنے پیچھے چند آدمیوں کے بولنے لی آواز سُنی۔ تینوں نے پلٹ کر دیکھا۔ مردان خان اور اُس کا ڈرائیور ہاتھوں میں ٹارچیں لیے اُنہی کی طرف آ رہے تھے۔ "عبد الغفور! پکڑو انہیں! بچ کر جانے نہ جائیں۔" مردان خان لڑکوں کو دیکھ کر پوری قوّت سے چلّایا۔ عبد الغفور کے ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور۔ وہ اندھادھند اُنہیں پکڑنے کے لیے بھاگا۔

"بھاگو!" عنبر نے نسیم اور عاقِب سے کہا۔ تینوں خرگوشوں کی طرح قبریں پھلانگتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھے۔ لوہے کا ڈبّا عنبر کے قبضے میں تھا اور وہ سیدھا اُس طرف دوڑ رہا تھا جدھر اُن کی کار کھڑی تھی۔

عبد الغفور اُن کا پیچھا کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رُکا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان تینوں میں سے کس کے تعاقب میں جائے، کیوں کہ وہ

الگ الگ سمتوں میں دوڑ رہے تھے۔ پھر اُس نے مردان خان کی آواز سُنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اس لڑکے کو پکڑو جس کے قبضے میں لوہے کا ڈبّا ہے۔"

لیکن اتنی دیر میں عنبر جھاڑیوں کے اندر پناہ لے چکا تھا۔ بڑی مُصیبت یہ تھی کہ عبدالغفور اور مردان خان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں جن کی روشنی دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ اس کے علاوہ عبدالغفور کے پاس ریوالور بھی تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کس وقت وہ گولی چلا دے۔ یکایک عبدالغفور نے چلّا کر کہا:

"او لڑکے! میں نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو جھاڑیوں میں سے باہر نکل آؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

عنبر اپنی جگہ دُبکا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ عبدالغفور نے اسے ہرگز نہیں دیکھا۔ خواہ مخواہ دھوکا دینے کے لیے چیخ رہا ہے۔ لیکن نہیں۔ وہ اُسی طرف ٹارچ کی روشنی پھینکتا ہوا آ رہا تھا۔ عنبر کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ یکایک ایک

درخت کی اوٹ سے نسیم باہر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں کِسی قبر سے اُکھڑا ہوا پتھّر کا ٹکڑا تھا۔ اُس نے پوری قوّت سے وہ پتھّر عبد الغفور کی کھوپڑی پر دے مارا۔ اُس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی، ٹارچ اور پستول ہاتھ سے چھوٹ گئے اور وہ چکرا کر نیچے گِر پڑا۔ نسیم نے جھپٹ کر دونوں چیزیں اُٹھا لیں۔

"نسیم، ٹارچ بُجھا دو فوراً۔" عنبر نے جھاڑیوں میں سے پُکار کر کہا۔ "اور یہاں آ جاؤ۔۔۔۔" نسیم نے اُس کے حکم پر عمل کیا۔ دُوسرے ہی لمحے وہ ہانپتا ہوا عنبر کے قریب جھاڑیوں میں آ چکا تھا۔ "عاقِب کہاں ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"پتا نہیں۔ بہر حال، وہ مردان خان کے ہاتھ نہیں آ سکتا۔ لمبی دوڑ میں کئی مرتبہ انعام حاصل کر چُکا ہے۔" نسیم اب بھی مذاق سے باز نہیں آ رہا تھا۔

اتنے میں دوسری ٹارچ کی روشنی چمکی۔ مردان خان اپنے ڈرائیور کو پُکارتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ جھاڑیوں کے نزدیک آ کر اُس نے ٹھوکر کھائی، لیکن گِرا

نہیں۔ پھر وہ جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ عبد الغفور بے ہوش پڑا تھا۔

”ارے! اِسے کِس نے مارا!“ اُس نے گرج کر کہا۔ پھر چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ اُسی وقت عنبر نے ٹارچ کی روشنی اس کی آنکھوں پر ڈالی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ جیسے اندھا ہو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر نسیم نے ایک ہوائی فائر کیا۔ گولی کی آواز قبرستان کے سنّاٹے میں توپ کے گولے کی طرح دُور دُور تک سُنی گئی۔

”مردان خان صاحب! مہربانی فرما کر اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا لیجیے ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“ نسیم نے للکار کر کہا۔ ”خبردار! ہلنے جُلنے کی کوئی کوشش نہ کیجیے۔ میرا نشانہ غضب کا ہے۔ اگر آپ نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو ابھی آپ کی لاش عبد الغفور کی طرح زمین پر پھڑکتی نظر آئے گی۔“ مردان خان نے بدحواس ہو کر اپنے بازو فضا میں بُلند کر دیے۔ ٹارچ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

”ٹارچ نیچے پھینک دو۔“ نسیم نے دوسرا حکم دیا۔ مردان خان نے ٹارچ

پھینک دی۔ نسیم نے دوسرا ہوائی فائر کیا۔ "ہاہاہا۔۔۔۔ کیا عُمدہ ریوالور ہے۔شاید ابھی اس میں سات گولیاں ہیں۔"

"چلو مردان خان! اُسی طرف جہاں تمہاری کار کھڑی ہے۔"عنبر نے کہا۔ "تم نئے شاداب نگر سے یہاں پیدل تو نہیں آئے ہو گے، لیکن ٹھہرو! اپنے اس ڈرائیور کو اُٹھا کر کندھے پر ڈال لو۔ میرا خیال ہے۔ یہ ابھی مرا نہیں ہو گا۔"

مردان خان نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ اُس نے جھُک کر عبد الغفور کو کندھے پر لاد لیا اور آگے چل پڑا۔ نسیم اور عنبر اُس اور پیچھے پیچھے تھے۔

ابھی وہ مُشکل سے دس پندرہ گز دُور گئے ہوں گے کہ سامنے سے اللہ داد ڈرائیور اور عاقِب آتے دکھائی دیے۔ اُن کے پیچھے پولیس کے چار سپاہی اور ایک افسر تھا۔

"میاں، آپ ٹھیک ٹھاک ہیں؟" اللہ داد نے عنبر اور نسیم سے پوچھا۔ "چوٹ ووٹ تو نہیں لگی!"

”ہم بالکل ٹھیک ہیں، اللہ داد۔“ نسیم نے جواب دیا۔

پولیس افسر نے مردان خان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آہا! خاں صاحب۔ بڑی مدّت بعد قابُو میں آئے ہو۔ ہم تو نہ جانے کب سے تمھاری تلاش میں دُنیا بھر کی خاک چھان چکے ہیں۔ یہ تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو گی۔ بہر حال، تشریف لائیے۔ اب آپ کو پولیس اسٹیشن لیے چلتے ہیں۔ وہیں آپ سے پوچھ گچھ ہو گی۔“

مردان خان اور عبد الغفور کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ اس دوران میں عبد الغفور کو ہوش آ گیا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی پولیس والوں کو دیکھتا، کبھی عنبر اور عاقِب کو گھورتا اور کبھی اللہ داد ڈرائیور کو دیکھنے لگتا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکّر ہے۔

راستے میں اللہ داد نے بتایا کہ عاقِب میاں نے واپس آ کر کہا کہ دو آدمی آپ لوگوں کو پکڑنے کے لیے قبرستان میں آئے ہیں۔ میں نے اُسی وقت کار میں لگے ہوئے ٹیلے فون کے ذریعے قریبی پولیس اسٹیشن کو اِطّلاع دی۔

تھوڑی دیر بعد پولیس والے آ گئے۔ انھوں نے فائرنگ کی آوازیں سُنیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ مردان خان اور عبدالغفور دونوں پُرانے بدمعاش ہیں۔ پولیس تو عرصے سے اُن کی کھوج میں لگی ہوئی تھی اور اُس نے اعلان کر رکھا ہے کہ جو شخص مردان خان کو گرفتار کرائے گا، اُسے دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔"

اگلے روز شہر کے بڑے سرکاری ہال میں ایک شان دار تقریب ہوئی۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے عنبر، نسیم اور عاقِب کو بہادری کے سرٹیفکیٹ اور اُس کے ساتھ دس ہزار روپے کا چیک بھی دیا۔ فوٹو گرافروں نے تصویریں اُتاری اور اخباری نامہ نگاروں نے خوب چٹ پٹی کہانیاں اپنے اخباروں کے لیے بنائیں، سرفراز بیگ کو اس کی قیمتی تصویر واپس مل گئی۔ اُس نے بھی ننّھے سُراغ رسانوں کو اپنی جانب سے دس ہزار روپے رقم انعام دینے کا اعلان کیا۔ پورے مُلک میں اُن کی واہ واہ ہو گئی۔

لیکن اس تمام واہ وا کے باوجود وہ اپنے ایک غریب دوست کو نہ بھُولے۔

فرصت پاتے ہی وہ خُدا بخش طوطے والے کے گھر گئے، محمّد دین سے گلے ملے، پانچ ہزار روپے اُسے دیے اور کہا۔ ”بابا خُدا بخش، اِس روپے سے اپنی بیماری کا علاج کراؤ اور مکان کی مرمّت کرو۔ اگر ضرورت پڑے تو اور روپیہ لے لینا۔“

خُدا بخش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے اُنہیں ہزاروں دُعائیں دیں۔ محمّد دین کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ جب وہ تینوں اُس کے گھر سے رُخصت ہوئے تو وہ دُور تک اُنہیں چھوڑنے آیا۔